فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	5
انوارِ ربانی	حج کی حکمتیں	شگفتہ عمر	7
قولِ نبیؐ	زکوٰۃ	ڈاکٹر ممتاز عمر	11
خاص مضمون	الیکٹرانک میڈیا کے اثرات ایک جائزہ(2)	ڈاکٹر گوہر مشتاق	14
نوائے شوق	غارِ ثور	ام عبدمنیب	17
	غزل	کرامت بخاری	18
	اے مری جائے اماں	شمیم فاطمہ	18
	غزل	شہود ہاشمی	19
	غزلیہ	طارق محمود طارق	19
حقیقت وافسانہ	کھِل گئی دل کی کھلی	قانتہ رابعہ	21
	زیور	ام ایمان	25
	پسِ آئینہ کوئی اور ہے	نگہت یاسمین	28
	لگن	عظمیٰ عمران	31
	ایک حقیقت ایک افسانہ	حمیرا خالد	35
منتخب افسانہ	پنجرے میں بسیرا	محمد منشایاد	28
خفتگانِ خاک	میری عظیم والدہ کچھ یادیں کچھ باتیں	محمد سہیل احمد	46
	میرے والد	عائشہ عثمان	49
سلسلہ وار آپ بیتی	داستانِ عطاو بخشش	ڈاکٹر ثمین ذکا	54
رپورتاژ	دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا	ذکیہ فرحت	61
نہاں خانہ دل	ہاتھ اور دعا	ساجدہ رفیق	66
محشر خیال	عشرت لطافت، تیمیہ صبیحہ، شازیہ مسلم، حفصہ افضال		68
بتول میگزین	عظمیٰ صدیقی، نجم السحر		71
حسن معاشرت	اللہ کے نام سے ابتدا	بشریٰ تسنیم	73
گھر داری	کچن کارنر	عنزہ عثمان، شازیہ مشتاق	75
حسن و صحت	صحت مند زندگی کیسے	ڈاکٹر نجیب الحق	78
منتخب کالم	جہاد افغانستان کے دس سال	محمد اسماعیل ریحان	79

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام ! لاکھ پہلوتہی کریں مگر بات سانحوں سے شروع کرنی پڑتی ہے۔ایک ماہ میں اتنی قیامتیں گزر جاتی ہیں کہ تذکرہ کرنے کے لئے انتخاب کرنا پڑتا ہے۔

بنا رہا ہے فلک بھی عذاب میرے لیے
تری زمین پہ کیا امتحان کچھ کم ہے !

اپنی تاریخ کے بدترین سیلاب میں ڈوبا ہوا سندھ، ڈینگی وائرس کے پھیلائے ہوئے موت کے جال میں پھنسا ہوا پنجاب، عید کے اگلے روز سے ہی کے پی، کوئٹہ اور کراچی میں خودکش حملوں کا سلسلہ، ڈرون حملوں میں بدستور جانوں کا ضیاع اور اب کلر کہار کا دلدوز سانحہ!36 گھروں میں ایک ساتھ اندھیرا ابھر گیا، تیس گھروں کے ننھے چراغ اکٹھے بجھ گئے، چہکتی آوازیں خاموش ہو گئیں۔

یہ کون اتنے دِیے تہہِ خاک رکھ گیا ہے
زمیں کی تاریک گود بھی جگمگا اٹھی ہے

جو علی الصبح ہنستے کھیلتے ہمجولیوں کے ساتھ نکلے تھے، ایک تفریح بھرا بے فکر دن اکٹھے گزار کر خوبصورت یادوں کی پوٹلی باندھے، تھکی آنکھوں میں نیند لیے سرِ شام گھروں کو لوٹ رہے تھے کہ ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ ماؤں کی خالی گودیں انتظار کرتی رہ گئیں۔کوئی ماں بھولے ہوئے لنچ باکس کا ملال لیے بیٹھی ہوگی، کسی نے قمیص کا بٹن صبح صبح ٹانکا ہوگا، کوئی راستے کے لئے کھانے کی چیزیں آدھی رات کو پیک کر کے سوئی ہوگی۔رزق کی دوڑ سے تھکے ہارے، صبح سوئے ہوئے باپ نے بمشکل آنکھیں کھول کر بوسہ دیا ہوگا، دادا نے سینے سے لگایا ہوگا۔اب وہی تصویریں آنکھوں کی پُتلیوں پر پتھر ہو جائیں گی۔صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں جو جلتے سینوں پر مرہم رکھتا ہے اور زندہ رہنے کے قابل بناتا ہے۔آزمائش ڈالنے والی ذات ہی جانتی ہے کہ نبھانے کا قرینہ کیسے دے گی۔ہم سب تو ہاتھ اٹھائے دعا گو ہیں کہ اللہ ان سب کو صبرِ جمیل عطا کرے آمین۔حقیقت یہ ہے کہ اس حادثے نے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

پاکستانیت، صبر و برداشت اور جبر و امتحان کا دوسرا نام ہے۔معمول سے زیادہ بارشیں ہونے اور سب ڈیم بھر جانے کے باوجود ملک میں بجلی کی کمی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔پٹرولیم کمپنیوں کو عدم ادائیگی اور اس کے نتیجے میں پٹرول کی قلت کے باعث بجلی گھروں کی پیداوار بے حد کم ہو گئی ہے۔اوپر سے بجلی بچانے کے لئے ایسے اقدامات تجویز کیے جا رہے ہیں جو سرکاری دفاتر کی خراب کارکردگی کو مزید خراب اور نجی کاروبار کو مزید متاثر کریں گے۔ملک بھر خصوصاً پنجاب میں متواتر کئی کئی گھنٹے بجلی بند رہتی ہے اور بجلی کے آنے کے اوقات گنے جانے لگے ہیں۔پٹرول اور ڈیزل کی قیمتیں بھی پھر بڑھائی جا رہی ہیں۔ان سب حالات کے باوجود امریکہ کی دھمکیوں نے قوم کو یکجان و یک آواز کر دیا ہے۔گو امریکہ گو کا نعرہ اب سارے ملک کی آواز بن کر گونج رہا ہے۔ڈومور کے جواب میں نومور کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور عوامی سطح پر گزشتہ دس سالوں کا غم و غصہ نکلنے کو بے تاب ہے۔

کل جماعتی کانفرنس سے کیا حاصل ہوا یہ ایک الگ بحث ہے مگر دو باتیں ظاہر ہو گئیں۔ایک یہ کہ اس پارلیمنٹ کی نمائندہ حیثیت قابلِ اعتبار نہیں رہی۔دوسری یہ کہ امریکی جارحیت کی صورت میں سیاسی اور عسکری محاذ پر قوم یک آواز ہے ۔ میاں نواز شریف کا کردار حسبِ معمول افسوسناک رہا اور

انہوں نے صورتحال کی نزاکت کا احساس کیے بغیر مولن اور پینٹا کے الزامات کو تقویت دی۔ مگر مشترکہ اعلامیے میں بہت سی باتیں خوش آئند ہیں مثلاً آزاد خارجہ پالیسی اور معیشت کی بہتری پر توجہ، نیز قبائلی شورش کے لئے فوجی ایکشن کے بجائے مذاکرات کا راستہ۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ اس اعلامیے کا حشر بھی پارلیمنٹ کی قراردادوں جیسا نہیں ہونا چاہیے جن میں فوجی آپریشن اور امریکی ڈرون حملوں کی فوری بندش کے مطالبے کئے جا چکے ہیں۔

کانفرنس میں جنرل کیانی اور احمد شجاع پاشا کے لہجے امریکہ کے لئے انتہائی سخت رہے۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہماری فوج بھی اب اس لاحاصل جنگ سے تھک چکی ہے اور امریکہ کے ناجائز مطالبے پورے کرتے کرتے اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو ہے۔ مشترکہ اعلامیہ میں امریکہ کی مذمت ہو نہ ہو، مگر کانفرنس میں فوجی ہائی کمان کا عوامی رہنماؤں کے ساتھ بیٹھنا امریکہ کے لئے بڑا واضح پیغام رکھتا ہے کہ اب ہماری فوج عوامی امنگوں کے برخلاف ہر قیمت پر امریکہ کی غلامی نہیں کرے گی۔ یہ امریکہ کے آگے جھکنے کا ہی نتیجہ ہے کہ اب ہر کوئی ہمیں آنکھیں دکھانے لگا ہے۔ ادھر سے بھارت ہمیں ممبئی حملوں میں ملوث کر رہا ہے تو اُدھر کرزئی صاحب بھی برہان الدین ربانی کی ہلاکت کا تعلق پاکستان سے جوڑ رہے ہیں۔ سچ ہے کہ دوسروں کی نظر میں ہمارا مقام و مرتبہ اس پر منحصر ہے کہ ہم خود کو کیا مقام و مرتبہ دیتے ہیں اور اپنی خودداری اور عزتِ نفس کے لئے کتنے حساس ہیں۔

امام انور الاولقی کی شہادت ایک اور بڑا سانحہ ہے۔ امت مسلمہ ایک سحر البیان مبلغِ دین سے محروم ہوگئی۔ یہ امریکی نژاد یمنی عالم جدید ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے فہمِ دین پھیلانے میں مصروف تھے۔ نوجوان نسل میں ان کے دروس اور خطبوں کو بے حد مقبولیت حاصل تھی۔ انگریزی زبان و بیان پر عبور اور جدید دور کے تقاضوں کو پوری طرح سمجھنے کے باعث بڑی موثر اور دل میں اتر جانے والی بات کرتے تھے۔ امریکی حکومت اور میڈیا بھی مسلسل اپنے بیانات میں اس بات کو دہرا رہے ہیں کہ ان میں لوگوں کو ''انسپائر'' کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی اور ان کی تقریری صلاحیت بے حد متاثر کن تھی کیونکہ وہ امریکی ماحول ہی میں پلے بڑھے تھے۔ شاید اسی لئے ان کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ شیخ حمزہ یوسف پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی۔ شیخ احمد یاسین کو شہید کر دیا گیا تھا۔ امریکہ کے اسلاموفوبیا کا یہ حال ہے کہ وہ جس شخص کے ذریعے بھی اسلام کے آفاقی پیغام کو کامیابی کے ساتھ پھیلتے ہوئے دیکھتا ہے اُسے وہ امریکی سلامتی کے لئے خطرہ سمجھتا ہے اور اس کا تعلق القاعدہ سے جوڑ کر اسے دہشت گرد قرار دے دیتا ہے۔ حالانکہ یہی القاعدہ ہے جسے عرب دنیا میں اپنے مقاصد کے لئے خود امریکہ تقویت دیتا ہے۔ امریکی سرزمین پر نہ سہی مگر پہلی بار علی الاعلان امریکہ نے اپنے ایک قانونی شہری کا ماورائے عدالت قتل کیا ہے امام انور نے نو گیارہ کی کھل کر مذمت کی تھی اور اپنے ملوث ہونے کی تردید کی تھی۔ پھر بھی انہیں گوانتاناموبے دیکھنی پڑی اور اب یمنی حکومت کے تعاون سے ان پر براہِ راست حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ہمیں ظالموں سے نجات دے۔ آمین

منظر بھوپالی کے ان شعروں کے ساتھ اجازت دیجئے۔

کدھر کو جائیں گے اہلِ سفر نہیں معلوم — وہ بد حواسی ہے اپنا ہی گھر نہیں معلوم
ہمارے شہر میں ہر روز اک قیامت ہے — یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں معلوم
ہمارا صبر تجھے خاک میں ملا دے گا — ہمارے صبر کا تجھ کو اثر نہیں معلوم
ہم اپنے گھر میں بھی بے خوف رہ نہیں سکتے — کہ ہم کو نیتِ دیوار و در نہیں معلوم

دعا گو: صائمہ اسما

سرورق اکتوبر: سیلاب میں گھرا ہوا صوبہ سندھ کا ایک گاؤں، کسی زندہ کی تلاش (تعاون: ام ہانی سیالکوٹ)
ستمبر: ڈوبتے سورج کی آگ سے دہکتا ہوا پانی۔ وادیِ کاغان کا ایک منظر (راشدہ ظہور کے کیمرے سے)
اگست: ملتان کی ایک درگاہ پر منقش خطاطی (راشد ظہور کے کیمرے سے)

حج کی حکمتیں

معمارِ حرم کی اس سنت میں اتنے فضائل پوشیدہ ہیں جیسے ہشت پہلوی ہیرا ہو، کہ ہر پہلو بے مثال!

شعائرِ حج پر نظر ڈالیے تو میاں بیوی اور بچے کے اعمال کو ہر طرف جلوہ گر پائیے گا۔ جس وادی غیر ذی زرع میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اکیلا چھوڑ گئے تھے وہ بلد الامین بن گئی۔ جس جگہ قیام کیا، حرم بن گیا۔ جہاں کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی وہ مقامِ ابراہیم بن گیا۔ جہاں ننھے اسماعیل علیہ اسلام نے پیاس سے بلبلا کر ایڑیاں رگڑیں، وہاں جسمانی و رُوحانی بیماریوں کا شافی آبِ زم زم جاری ہو گیا۔ حضرت ہاجرہ کی صفا و مروہ کے درمیان تلاشِ آب میں لگائی گئی دوڑ حج و عمرہ کا لازمی رکن ٹھہرا اور مادریت کے اس جذبے کو سراہنے کے لئے مردوں کا اسی طرح تیز دوڑنا لازمی قرار دیا۔ منیٰ کی اسی وادی میں اپنی زندگی کی متاع گراں بہا، آنکھوں کی ٹھنڈک نوجوان بیٹے کو محض خواب میں اشارہ پا کر راہِ حق میں قربان کر دیا۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر لختِ جگر کے حلقوم پر چھری پھیر دی۔ اس ذبحِ عظیم کی یادگار یعنی قربانی نہ صرف حج پر آنے والوں بلکہ دنیا کے ہر حصے میں بسنے والے صاحبِ نصاب مسلمانوں پر فرض کر دی گئی۔ قربانی کے اس مقام پر جہاں جہاں شیطان نے بہکانے کی کوشش کی تھی وہاں جمرات پر آج بھی حجاج کرام کنکریوں کے ذریعے شیطان کو دور بھگانے کا عزم تازہ کرتے ہیں۔

مقام ابراہیم حرم کعبہ میں مسلمانوں کا مصلّٰی ہے:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (البقرہ 145)

اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنالو۔

اہل ایمان کی کوئی نماز مکمل ہی نہیں ہوتی، جب تک کہ درودِ ابراہیم جزو عبادت نہ ہو۔ اسوہ ابراہیمی علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور زندگی قابل تقلید نمونہ قرار دی گئی تو وہ اسوہ محمدی ﷺ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ (الاحزاب ۲۱)

(اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شروع کردہ حج کا نظام آج تک قائم ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے سے ایک مدت بعد جب عرب میں بہت سی خرابیاں پھیل گئیں اور ہر طرف بت پوجے جانے لگے تو لوگوں نے حج کی اصل رسوم میں بھی تبدیلیاں کر دیں، یہاں تک کہ خانہ کعبہ میں بھی بت لا کر رکھ دیئے۔ مگر جب حضرت محمد ﷺ کا زمانہ آیا اور آپ ﷺ نے مکہ فتح کر لیا تو خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا اور حج کی رسوم کو از سرِ نو اسی طرح جاری کر دیا جیسے کہ وہ پہلے تھیں۔

۸ھ میں مکہ فتح ہونے کے باوجود حج مشرکوں ہی کے طریقے سے ہوا۔ اگلے سال ۹ھ میں حضور ﷺ نے مسلمان کا ایک قافلہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی سربراہی میں حج کے لئے بھیجا۔ اسی حج کے دوران یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ آئندہ سے کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اگلے سال ۱۰ھ میں حضور ﷺ خود ایک لاکھ مسلمانوں کے ساتھ حج کرنے تشریف لے گئے۔ اسی حج کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے کیوں کہ اس کے بعد پھر حضور ﷺ کی زندگی میں دوسرے حج کی نوبت نہ آئی۔ اس حج کے دوران آپ ﷺ نے بار ہا فرمایا: **خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ** ''سے حج کے طریقے سیکھ لو'' (صحیح مسلم)۔ چنانچہ آج دنیا بھر کے اہل ایمان حضور اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق حج کی فرض عبادت کی ادائیگی کرتے ہیں۔

حج کی عالمگیریت اور امت مسلمہ کی ہم آہنگی

سید سلیمان ندویؒ سیرۃ النبی جلد پنجم میں خانہ کعبہ کی مرکزیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ اسی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملک میں اپنے حالات میں گرفتار ہیں وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتیں جھیل کر، دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ہیں، ایک دوسرے کے درد وغم اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں، اس سے اُن میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے۔ یہیں آ کر چینی مراکشی سے، تونسی ہندی سے، تاتاری حبشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے یمنی نجدی سے، ترقی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روسی الجزائری سے، افریقی یورپین سے، جاوی بلغاری سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔'' (ص۔207)

سید سلمان ندویؒ کے الفاظ میں حج اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی وملی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی اور مسلمانوں کی عالمگیری بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

حج محبت الٰہی کے حصول کا ذریعہ اور مظہر

حج کیا ہے؟ اللہ سے محبت کرنا اور اس کی محبت پانا۔ یہ فریضہ ہمیں محبت، عقیدت اور اخلاص کا وہ سبق سکھاتا ہے جو اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے خاندان نے سیکھا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ یعنی وہ سب کچھ چھوڑ کر صرف اللہ کے بن گئے تھے، اسی کے ہو رہے تھے۔ انہوں نے ہر محبت کو ترک کر کے اپنی زندگی کا رخ صرف اللہ کی طرف کر لیا تھا:

اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ

یہی حج کا سبق ہے:

قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ لَا شَرِیۡکَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (الانعام)

(کہہ دو) کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی بات کا حکم ملا ہے، اور میں سب سے اول فرمانبردار ہوں۔

حج تمام عبادات کا جامع ہے

حج اسلام کا پانچواں اور تکمیلی رکن ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے حدیث جبریلؑ میں ارکانِ اسلام کی تفصیل بیان فرمائی ہے جس کے مطابق اسلام کا پہلا رکن کلمہ شہادت کا اقرار، دوسرا رکن نماز، تیسرا رکن زکوٰۃ، چوتھا رکن رمضان کے روزے اور پانچواں رکن صاحب استطاعت کے لئے حج بیت اللہ ہے۔ حج پر ارکانِ اسلام مکمل ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس تکمیل کی بشارت حجۃ الوداع کے موقع پر ان الفاظ میں سنائی:

اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا (المائدہ)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

چنانچہ حاجی حج کے ذریعے سے صرف ایک رکن کی ادائیگی کا شرف حاصل نہیں کرتا بلکہ ارکانِ اسلام کی تکمیل کا شرف حاصل کرتا ہے اس کے علاوہ حج میں اسلام کی تکمیل اس معنی میں بھی شامل ہے کہ حج تمام عبادات کا جامع ہے۔ اس میں قدم قدم پر توحید کی شہادت اور اللہ کی کبریائی کا اظہار ہے۔ اس میں نماز باجماعت کی ادائیگی اور اس کے ذریعے نظم وضبط اور اطاعت کے اظہار کی عملی تربیت کا یہ انداز ہے کہ اللہ کے حکم پر مکہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفان، عرفات سے مزدلفہ، مزدلفہ سے منیٰ، منیٰ سے مکہ اور پھر منیٰ چلے جا رہے ہیں۔

زکوٰۃ اللہ کی رضا کی خاطر اپنے مال کو پاکیزگی کے حصول کے لئے خرچ کرنے کا نام ہے۔ حج کے تمام اخراجات اللہ کی محبت کی

خاطر اور گناہوں سے پاک زندگی کے حصول کے لئے اٹھانا، اس عبادت میں زکوۃ کی تربیت کو بھی داخل کر دیتا ہے۔

روزہ ضبطِ نفس کی تربیت دینا ہے اور اللہ نے اس کا مقصد تقویٰ کا حصول بتایا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ ۱۸۲)

تم پر روزے فرض کر دیئے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔

حج بھی وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (البقرہ ۱۹۷) (سفر حج کے لئے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بہتر زادِ راہ پرہیز گاری ہے)، کی ہدایت کے ساتھ گناہوں سے پاک حج کو حجِ مبرور گردانتے ہوئے نئی زندگی کی بشارت سناتا ہے:

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرہ ۱۹۷)

حج کے دوران نہ تو کوئی شہوانی فعل ہونا چاہیے اور نہ کوئی بدعملی اور نہ کوئی لڑائی جھگڑے کی بات۔

حج میں قربانی بھی ہے جو محض یوم النحر کے ذبیحہ تک محدود نہیں بلکہ سفر حج کے اخراجات، قیام حرمین اور مناسک حج کی ادائیگی کے دوران قدم قدم پر ایثار و قربانی کے مظاہر پر مبنی ہے۔

سب سے بڑھ کر حج میں اسلام کی چوٹی جہاد کا اجر بھی ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ کیا عورتوں پر بھی جہاد فرض ہے؟ فرمایا تھا: ہاں لیکن ان کے جہاد میں قتال نہیں ہے (سنن ابن ماجہ) اور یہ کہ کمزوروں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو حج کا ثواب جہاد کے برابر ملتا ہے۔ (صحیح بخاری)

حج بندگی رب اور اطاعتِ رسول ﷺ کا مظہر

دراصل حج میں اسلام کی تکمیل کا یہ پہلو بھی ہے کہ اسلام یعنی فرماں برداری و اطاعت کو حج کے ذریعے کمال حاصل ہوتا ہے۔ اسلام نام ہے بغیر چوں چراں احکاماتِ الٰہی اور سنت رسول اللہ ﷺ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا اور اسلام کا یہ کمال حج میں حاصل ہوتا ہے۔

حج کے تقریباً سارے افعال سعی و جہد اور حرکت پر مبنی ہیں۔ گھر سے بیت اللہ تک کا سفر اور اس کے مراحل، بیت اللہ کے گرد طواف، صفا و مروہ کی سعی، مکہ سے منیٰ کوچ، منیٰ سے عرفات میں جمع ہونا، شام ہوتے ہی وہاں سے چل پڑنا اور مزدلفہ پہنچ کر رات کی چند ساعتیں گزار کر صبح واپس منیٰ پہنچنا، رمی اور قربانی کے بعد پھر مکہ جا کر طوافِ زیارۃ اور سعی کرنا، پھر ایام تشریق گزارنے کے لئے منیٰ واپس پہنچنا۔ اللہ کے ہر حکم اور پکار پر لبیک کہنا۔ جیسے بھی حالات ہوں، تعمیل حکم کے لئے کھڑے ہو جانا۔ اپنی کوشش اور جدوجہد میں کوئی کسر نہ چھوڑنا، تمام وسائل اور تدابیر اختیار کرنے کے بعد اللہ پر یقین و اعتماد کرتے ہوئے ہر معاملے میں اسی پر توکل رکھنا۔ یہی بندگی رب کا خلاصہ ہے۔ حج کے تمام افعال ان تمام پہلوؤں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ کامل بھی تازہ کرتے ہیں اور ان صفات کو ہمارے اندر راسخ کرنے کا کام کرتے ہیں۔ بعینہٖ خود تمام افعال و حج و عمرہ کی ادائیگی حضور اکرم ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری اور سنت پر عمل کی متقاضی ہے۔

حضرت عمرؓ کا حجر اسود کا بوسہ لیتے وقت فرمانا:

''اے حجر اسود میں جانتا ہوں کہ تو محض ایک پتھر ہے، تو کسی کو نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ فائدہ۔ اگر میرے آقا حضرت محمد ﷺ نے تجھے نہ چوما ہوتا تو میں ہرگز تجھے نہ چومتا'' (صحیح بخاری)

اسی طرح رمل و اضطباع کو دیکھئے۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ نے ایک خاص مصلحت کے تحت یہ انداز اپنایا تھا۔ گو اب وہ ضرورت باقی نہ رہی لیکن امت کے تعامل نے اسے سنت کی حیثیت سے برقرار رکھا۔

عرفات اور مزدلفہ میں ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں کی ادائیگی کی صورت بھی اسی کی مثال ہے۔ یہی نمازیں ہیں کہ

جنہیں اپنے مقررہ وقت پر پڑھنا لازم ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا (النساء:103)

بے شک نماز مومنین پر پابندی وقت کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔

مگر عرفات اور مزدلفہ میں ان ہی نمازوں کو اپنے اوقات سے ہٹا کر پڑھنا عین عبادت ہے کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ایسا ہی ہے۔

حج کی روح اور حقیقت

جو عبادات اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کی ہیں، ان میں سے ہر عبادت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن یعنی گویا ایک جسم ہے اور ایک اس کی روح۔

نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی طرح حج کے تمام مناسک اس کا ظاہر یعنی جسم ہیں اور اس کی روح مقصد حج ہے۔ حج کے تمام اعمال ایک خاص غرض اور روح رکھتے ہیں، جس طرح پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ حج میں تمام ارکان اسلام کی تکمیل بھی ہے۔ چنانچہ جس طرح دیگر فرض عبادات کی ادائیگی اپنے باطن میں تقویٰ کی صفت کا لازمی تقاضا کرتی ہیں، اسی طرح تکمیلی عبادت کے پہلو سے حج کے لئے بھی باطنی سرمائے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اللہ کی رضا کی طلب، تقویٰ کی چاہت اور احکامات شریعت پر تسلیم خم کر دینے کی صلاحیت بلا شبہ تمام عبادات کی جو شکلیں اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے مقرر کر دی ہیں، وہ نہایت اہم ہیں اس لئے کہ انہیں ادا کیے بغیر نہ تو یہ عبادات ادا ہوتیہے اور نہ وہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے جو مطلوب ہے۔ دوسری طرف اگر یہ عبادات اپنے حقیقی مقصد اور روح سے خالی ہوں تو نہ تو تعمیر سیرت میں معاون ہوسکتی ہیں اور نہ اللہ کے ہاں قبولیت کا مقام حاصل کرسکتی ہیں۔

اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حج کے ظاہری آداب و اعمال کے سلسلے میں کسی ممکنہ کوتاہی سے بچنے کی کوشش کے ساتھ بہت نظر رہے تا کہ مناسک کی ادائیگی کے ساتھ مقصد حج کی تکمیل بھی ممکن ہو۔ مناسک میں کوتاہی کی تلافی جنایات حج وعمرہ اور روح حج کی تکمیل سے ممکن ہے لیکن روح حج کی کسی کمی کی تلافی کسی ظاہری عمل سے ممکن نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان و وفا کی قرآن نے شہادت دی:

وَ اِبۡرٰہِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی (النجم 37:53)

اور ابراہیم جس نے وفا کا حق ادا کر دیا۔

اگر ہر سال دنیا کے دور دراز علاقوں سے جمع ہونے والے لاکھوں حاجی حج کے ان پیغامات کو سمجھ سکیں اور اپنے عمل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رنگ اختیار کرسکیں تو یقیناً امت مسلمہ کی بھنور میں پھنسی کشتی پار لگ سکتی ہے اور مسلمانوں کے حق میں استخلاف فی الارض کا وعدہ پورا ہوسکتا ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں ، لا الہ الا اللہ

☆☆☆

ڈاکٹر ممتاز عمر

زکوٰۃ

معاشی و معاشرتی ہمواری میں مددگار

نبی محترمؐ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے اس لئے زکوٰۃ فرض کی ہے کہ اس کے ادا کرنے سے تمہارا باقی مال پاک و صاف ہو جائے۔'' (ابوداؤد)

اسلام کی تعلیم اور حضرت محمد ﷺ کے صحیفۂ وحی میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ قرآن حکیم میں ''اقیموا الصلوٰۃ واٰتو الزکوٰۃ'' کے الفاظ اکٹھے ذکر کیے گئے ہیں۔ بارگاہِ نبویؐ میں آ کر جب بھی کسی نے اسلام کے احکامات دریافت کیے تو ہمیشہ رسولؐ اللہ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کا حکم سُنایا۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ میں حضرت جریر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے تین باتوں پر رسولؐ اللہ سے بیعت کی۔ نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔ 9ھ ہجری میں رسولِ اکرمؐ نے حضرت معاذؓ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن روانہ کیا تو فرمایا کہ پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا، جب وہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے، جب وہ نماز پڑھ لیں، تو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان ہی کے غریبوں کو دی جائے گی۔

زکوٰۃ کے معنی پاکی اور صفائی کے ہیں۔ اپنے مال میں سے ایک حصہ حاجت مندوں اور مسکینوں کے لئے نکالنے کو زکوٰۃ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس طرح آدمی کا مال اور اس مال کے ساتھ خود آدمی کا نفس بھی پاک صاف ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ کا اطلاق سال گزرنے کے بعد مقررہ نصاب کے مطابق مال کے اس حصے پر ہے جو محتاجوں اور ضرورت مندوں کے لئے رب تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ قرآنِ مجید فرقان حمید میں بیاسی (۸۲) مرتبہ تاکید سے لگایا جا سکتا ہے۔ نبی محترمؐ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے اس لئے زکوٰۃ فرض کی ہے تا کہ اس کے ادا کرنے سے تمہارا باقی مال پاک وصاف ہو جائے۔'' (ابوداؤد)

زکوٰۃ نہ دینے والوں کی مثال ایسی ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے کسی کو دولت بخشی اور وہ اسکے بندوں کا حق نکالنے میں بخل کا ثبوت دے تو اس کے مال کی ناپاکی کے ساتھ نفس کے ناپاک ہو جانے کا احتمال بھی ہے اس کا دل اتنا تنگ، خودغرض اور زر پرست ہے کہ جس خدا نے اس کو حقیقی ضروریات سے زیادہ دولت دے کر اس پر احسان کیا، اس کے احسان کا حق ادا کرتے ہوئے بھی اس کا دل دُکھتا ہے۔ ایسے شخص سے کیا اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ دنیا میں کوئی نیکی بھی خدا کے واسطے کر سکے گا۔ کوئی قربانی بھی محض اپنے دین و ایمان کی خاطر برداشت کرے گا۔ لہٰذا ایسے شخص کا دل بھی ناپاک اور اس کا وہ مال بھی ناپاک ہے جسے وہ اس طرح جمع کرے۔

منکرینِ زکوٰۃ کو دائرۂ اسلام سے خارج تصور کیا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرب کے بعض ایسے قبائل سے جو زکوٰۃ کی ادائیگی کے منکر تھے اس طرح جنگ کی جیسے کفار سے کی جاتی ہے اور فرمایا ''اللہ کی قسم! جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اللہ کی قسم! جو رسولؐ کے زمانے میں بھیڑ کا بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑے گا۔'' (بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے بغیر نماز، روزہ اور ایمان کی شہادت سب بیکار ہیں، کسی چیز کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

نصاب اور ادائیگی کا طریقہ کار

ہمارے معاشرے میں زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے اور خود کو اس

سے باہر رکھنے کی دانستہ و نادانستہ کوشش کی جاتی ہے۔ احادیث کی روشنی میں ساڑھے سات تولے سونے یا ساڑھے باوَن تولے چاندی کی موجودگی یا اس رقم کے مساوی رقم پر زکوٰۃ فرض ہے۔ یہاں بعض اختلافی مسائل پیدا ہوتے ہیں جن میں دونوں میں کسی چیز کا پورا نہ ہونا یا موجود رقم کو شامل نہ کرنا۔ بچنے کی ایک راہ یہ نکالی جاتی ہے کہ ہمارے پاس تو صرف چھ تولے سونا یا پینتالیس تولے چاندی ہے۔ مگر ذرا ان کے معاملات پر غور کیجئے اور ان سے کہیں کہ یومِ نصاب تمام زر و مال و مالِ تجارت یکجا کیجئے یعنی آپ کے پاس جو رقم موجود ہے اور ساتھ ہی مالِ تجارت بھی۔ انہیں یکجا کر لینے کے بعد اگر چاندی والی شرح کے مطابق رقم بن جائے تو آپ صاحبِ نصاب ہو گئے کیونکہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس سلسلے میں ایک اصول یہ طے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینے کے لئے کم سے کم نصاب کو مقرر کیا جائے جس کے مطابق ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے مساوی سونے یا نقد رقم کی موجودگی میں زکوٰۃ ادا کرنی چاہیئے۔

بعض گھرانے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے موجود زیورات کو بہو، بیٹیوں کے نام سے موسوم کر کے مقررہ حد سے خود کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہوتا ہے کہ کُل سونا تو دس تولے ہے جس میں سے تین تولے میری اہلیہ کا اور بقایا دونوں بیٹیوں کے لئے ہے جو ان کی شادی پر انہیں دینا ہے۔ مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابھی وہ بیٹیاں آپ کی کفالت میں ہیں۔ ایسی صورت میں آپ ہی ان کے اُمور کے مختارِ کُل ہیں۔ یہی نہیں بعض مواقع پر ساس اور بہو کے زیورات کو بھی الگ الگ ظاہر کر کے بچت کی راہ ڈھونڈی جاتی ہے حالانکہ اس گھرانے کے کھانے پینے اور دیگر اخراجات مشترکہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں سے واقف ہے اس طرح کے عمل سے کسے دھوکہ دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایک اور مسئلہ جو عام طور پر لوگوں کو درپیش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نصاب کس موقع پر طے کیا جائے؟ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ سال کے کسی ایک دن اپنے تمام حسابات کو مجتمع کیجئے اور اس روز موجود رقم یا زیورات پر زکوٰۃ ادا کیجئے۔ یہ دن شعبان المعظم کا آخری اور رمضان المبارک کا پہلا بھی ہوسکتا ہے۔ اکتیس دسمبر یا یکم جنوری وغیرہ بھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن گھرانوں میں نو بیاہتا دلہن مقررہ تاریخ سے کچھ پہلے آئی ہو تو نصاب کا تعین دلہن کے زیورات پر کیسے ہوگا؟ تو عرض ہے کہ زیورات دلہن کے گھر رہے ہوں یا موجودہ مقام پر ہوں پھر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ آپ کی بیٹی چند روز قبل رخصت ہوئی ہو اور طویل عرصہ تک اس کے زیورات آپ کے پاس رہے مگر یومِ نصاب نہیں آیا، اس لئے بہو کے یومِ نصاب آنے سے قبل والے زیورات جن پر آپ کے گھر سال نہیں گزرا، زکوٰۃ ادا کی جانی چاہیے۔ ویسے خیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا حکم ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال پاک صاف اور محفوظ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح مالِ تجارت پر بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کو یقینی بنایئے مقررہ یومِ نصاب پر اپنے تمام تجارتی مال کی رقم کا تعین کر کے زکوٰۃ کی ادائیگی کریں تاکہ اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے۔ یہاں بعض صاحبان دکان کی قیمت یا دکان میں لگے سامان کی بابت پوچھتے ہیں۔ صرف مالِ تجارت پر زکوٰۃ ہے جو چیزیں اس میں استعمال ہوں اُن پر نہیں۔ مثلاً دکان میں لگے بلب، الماریاں یا ناپ تول کے لئے استعمال ہونے والی اشیاء۔

ایک سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ جو رقم یا زیورات نصاب کے تعین کے وقت بھول سے رہ جائیں تو کیا کیا جائے؟ اس کا آسان حل یہ ہے کہ جب بھی یاد آئیں اس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ قرض میں لی گئی اور دی گئی رقم کے بارے میں کہ زکوٰۃ کون ادا کرے گا؟ چونکہ قرض لینے والا ضرورت مند ہے اور قرض دینے والا صاحبِ ثروت اس لئے بہتر یہ ہے کہ قرض دینے والا ہی اس رقم پر زکوٰۃ ادا کرے۔

کسی ضرورت کے پیشِ نظر پیشگی زکوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے اور کسی خاندان کی امداد اور بحالی کے لئے احتیاط کے پیشِ نظر اس خاندان کو یکمشت زکوٰۃ کی ادائیگی کے بجائے ماہانہ ادائیگی کی جاسکتی ہے اس کے لئے سال بھر کے بعد زکوٰۃ یا ہر ماہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد مقررہ یوم نصاب پر حساب کر کے بقایا رقم ادا کی جاسکتی ہے۔ عام زندگی میں یہ بات اُلجھتی ہے کہ متوقع ملنے والی کمیٹی یا سرکاری ملازمت میں جی پی فنڈ

وغیرہ کی رقم پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے یہاں یہ سمجھ لیں کہ جو چیز آپ کے پاس نہیں اس کی بابت مطالبہ بھی نہیں ہاں !یوم نصاب سے قبل ملنے والے جی پی فنڈ یا کمیٹی پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اس وقت اتنی بڑی رقم پر زکوٰۃ کی ادائیگی میں چون وچرا سے کام نہیں لینا چاہیے۔

مصارف

۱۔زکوٰۃ کسی علاقے میں وہاں کے اہل ثروت سے جمع کر کے ضرورت مندوں میں تقسیم کی جانی چاہیے لیکن یہ کوئی لگا بندھا اُصول نہیں ہے۔ اگر علاقے میں ضرورت مند نہ ہوں اور دوسرے علاقے میں ضرورت مند ہوں تو کہیں بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

۲۔زکوٰۃ کے مصارف میں سب سے اہم ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے۔ اس طرح اللہ اور دین کے دشمنوں کے خلاف اللہ کے حکم سے نکالا ہوا مال خرچ ہوتا ہے۔

۳۔طلباء وطالبات کی ضروریات، مدارس کی تعمیر اور مدرسین کی تنخواہیں بھی ایک مصرف ہے۔

۴۔غریبوں، ناداروں، مساکین اور بیواؤں کے روزمرہ کے اخراجات اور ضروریاتِ جاریہ بھی پوری کی جاسکتی ہیں۔

۵۔زلزلہ، سیلاب یا کسی تباہی کی صورت میں ضرورت مندوں کی امداد، بحالی، زخمیوں کے علاج اور مرحومین کے کفن دفن میں بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف فی سبیل اللہ متعین ہیں جس کا افضل ذریعہ تو جہاد ہے۔لیکن لغوی اور اصطلاحی معنوں سے ظاہر ہے کہ اللہ کی راہ میں یا اللہ کے بندوں کی فلاح کی خاطر بھی اسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ صورت مندرجہ بالا ضروریات کے بعد ہوسکتی ہے۔ مثلاً پُل، سڑکیں، مدارس، لائبریری، سرائے، طعام خانے اور دینی کتب کی اشاعت بھی اس زمرے میں آتی ہیں۔

احتیاط

۱۔بعض فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ ایسے قریبی عزیزوں کو زکوٰۃ نہیں دینی چاہیے جن کا نفقہ تم پر واجب ہو یا جو تمہارے شرعی وارث ہوں۔ البتہ دُور کے عزیز زکوٰۃ کے حق دار ہیں، بلکہ دوسروں سے زیادہ حق دار ہیں۔مگر امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ نکال کر اپنے ہی عزیزوں کو نہ ڈھونڈتے پھرو۔

۲۔ زکوٰۃ صرف مسلمان کا حق ہے ، غیر مسلم کا حق نہیں ہے۔حدیث میں زکوٰۃ کی تعریف یہ آئی ہے، ترجمہ ''یعنی وہ تمہارے مال داروں سے لی جائے گی اور تمہارے ہی فقیروں میں تقسیم کر دی جائے گی۔'' البتہ غیر مسلم کو عام خیرات میں سے حصہ دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ عام خیرات میں یہ تمیز کرنا اچھا نہیں ہے کہ مسلمان کو دی جائے اور کوئی غیر مسلم مدد کا محتاج ہو تو اس سے ہاتھ روک لیا جائے۔

۳۔امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہر بستی کی زکوٰۃ اُسی بستی کے غریبوں میں صرف ہونی چاہیے۔ایک بستی سے دوسری بستی میں بھیجنا اچھا نہیں ہے۔ الّا یہ کہ وہاں کوئی حق دار نہ ہو یا دوسری جگہ کوئی ایسی مصیبت آ گئی ہو کہ دُور نزدیک کی بستیوں سے مدد پہنچنی ضروری ہو۔جیسے سیلاب یا قحط وغیرہ۔قریب قریب یہی رائے امام مالکؒ اور امام سفیان ثوریؒ کی بھی ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ زکوٰۃ بھیجنا ناجائز ہے۔

ڈاکٹر گوہر مشتاق (امریکہ)

الیکٹرانک میڈیا کے اثرات، ایک جائزہ

بچوں کو دجالی میڈیا سے بچانے کے مشورے

امریکہ کی خاتون محقق میری ون نے اپنی کتاب ''The plug in drug'' میں گھر میں ٹی وی دیکھنے کو کم کرنے کے لئے بعض مفید مشورے دیئے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ پرانا ٹی وی سیٹ رکھیں

اگر آپ کے گھر میں قدیم ٹی وی سیٹ ہے تو آپ نیا، فلیٹ سکرین ٹی وی مت خریدیں۔ پرانا ٹی وی اور اُس کی کمتر تصویر کی کوالٹی کی وجہ سے بچے آہستہ آہستہ ٹی وی سے خود ہی متنفر ہو جائیں گے۔ یہی حال کمپیوٹر کا ہے۔ ہم جتنا تیز انٹرنیٹ کنکشن حاصل کریں گے بچے اتنا ہی زیادہ تیزی سے انٹرنیٹ پر بہت سی windows کھول کر فحاشی کا نظارہ کر سکیں گے۔ اس لئے انٹرنیٹ کے سست (slow) کنکشن کو رحمت سمجھیں

۲۔ ٹی وی اور کمپیوٹر کو گھر میں کہاں رکھا جائے

میری وِن والدین کو مشورہ دیتی ہیں کہ وہ ٹی وی اور کمپیوٹر کو لِونگ روم (Living room) میں رکھیں جہاں تمام فیملی کے لوگ آ کر بیٹھتے ہیں۔ اس طرح بچے اپنی مرضی کے چینل نہیں دیکھ سکیں گے کیونکہ گھر کے بڑے وہاں موجود ہونگے۔ بچے انٹرنیٹ کے استعمال میں بھی محتاط ہونگے کیونکہ انہیں خوف ہوگا کہ کوئی بڑا اُن کی انٹرنیٹ کی کارروائی کو کسی بھی وقت پیچھے سے آ کر دیکھ سکتا ہے۔ مزید برآں، ٹی وی کو اوپر کی منزل میں کسی بیڈروم میں رکھنا بھی شیطان کو دعوتِ گناہ دینے کے مترادف ہے۔

۳۔ گھر میں کتنے ٹی وی سیٹ ہونے چاہئیں

والدین بچوں کے ٹی وی دیکھنے کو کس حد تک کنٹرول کر سکتے ہیں، یہ اس بات پر بہت منحصر ہے کہ گھر میں کتنے ٹی وی سیٹ موجود ہیں۔ ایک عمرانی سائنسی تحقیق جو Journal of Broadcasting کے 1980ء کے شمارے میں چھپی، کے مطابق والدین کے بچوں کے ٹی وی دیکھنے کے کنٹرول parental TV control پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں سب سے اہم عنصر (crucial family variable) یہ تھا کہ گھر میں کتنے ٹی وی سیٹ موجود ہیں۔ تحقیق میں یہ دریافت ہوا تھا کہ گھر میں جتنے زیادہ ٹی وی سیٹ موجود تھے، والدین کا بچوں کے ٹی وی پر کنٹرول اتنا ہی کم تھا۔

Gross.Lyme s. and Walsh, R. patricea(summer1980)"Factors Affecting poarental control over Children,s Televisian warning: A pilot study" journal of Broadcasting

اس تحقیق کے محققین نے والدین کو یہ مشورہ دیا:

جو والدین اپنے بچوں کی ٹی وی دیکھنے کی عادت پر کنٹرول کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ اگلی مرتبہ جب اُن کا ٹی وی سیٹ خراب ہو تو اسے ٹھیک مت کروائیں۔

۴۔ نوجوانوں کے بیڈروم میں ٹی وی اور کمپیوٹر نامنظور

والدین چاہے اپنے بچوں اور نوجوانوں کے میڈیا کے استعمال پر کتنی کڑی نظر رکھیں، اگر وہ ناسمجھی میں اپنے بچوں اور نوجوانوں کے بیڈروم میں ٹی وی یا کمپیوٹر رکھ دیں تو اُن کی ساری محنت پر پانی پھر جاتا ہے۔ اس کی آخر کیا وجہ ہے؟ بچوں کے کمرے سے میڈیا کو دور رکھنا ایک بہترین قسم کا فطری کنٹرول ہے 1999ء میں امریکہ کی بچوں کے ڈاکٹروں کی اکیڈمی (American academy of pediatricians) نے بچوں کے ڈاکٹروں (pediatricians) کے لئے ایک پالیسی جاری کی تھی جس میں انہوں نے ڈاکٹروں سے کہا تھا کہ وہ بچوں کے کمروں کو الیکٹرانک میڈیا سے پاک فضا (electronic media- free environment) والا بنانے

کی ترغیب دیں۔

" policy statement-media education"(Aug1999)

اس پالیسی میں ڈاکٹروں کو کہا گیا تھا کہ وہ والدین کو واضح الفاظ میں یہ نصیحت کریں:

"remove television sets from childrens bedrooms"

(اپنے بچوں کے بیڈروم سے ٹی وی سیٹ نکال باہر کریں)

امریکہ میں بچوں کے میڈیا کے استعمال سے متعلق ایک بڑے سروے میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ ایسے بچے اور نوجوان جن کے اپنے بیڈروم میں ٹی وی سیٹ ہوتا ہے اُن سے زیادہ ٹی وی دیکھتے ہیں جن کے ڈرائینگ روم میں ٹی وی رکھا ہوتا ہے۔ چونکہ بچے زیادہ تر مطالعہ کتب اپنے بیڈ روم میں کرتے ہیں اس لئے ٹی وی یا کمپیوٹر کی بیڈ روم میں موجودگی لامحالہ اُن کے پڑھائی کے ٹوٹل وقت کو کم کر دیتی ہے۔ اسی سروے میں یہ خبر بھی بتائی گئی ہے کہ 2 سال سے 18 سال کے بچوں اور نوجوانوں میں سے 53 فیصد کے بیڈروم میں ٹی وی (یا کمپیوٹر) موجود ہوتے ہیں۔

stanger,J and Gridina,N (2000) "media in the home1999: the fourth Annual survey of parents and Children" APPC, washington D.C

۵۔ والدین کو بیرونی امداد

اکثر اوقات والدین کو دوسرے لوگوں یا اداروں کی طرف سے نصیحت اُن کی حوصلہ افزائی کا موجب ہوتی ہے۔ جب American academy of Pediatrics نے 1999ء میں واضح طور پر یہ اعلان کیا تھا کہ دو سال سے کم عمر کے بچوں کو ٹی وی نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ اس سے اُن کے دماغ کی نشوونما پر برے اثرات پڑ سکتے ہیں تو مغربی ممالک کے والدین نے اس اعلامیے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک سکول کی ہیڈ مسٹریس نے میری ون (Marie winn) کو بتایا تھا:

''والدین اپنے بچوں کے ٹی وی دیکھنے کے متعلق احساس گناہ کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں ایسا کرنا نہیں چاہیے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مسئلے پر ہمارے سکول نے جو قدم اٹھایا ہے اور والدین کو ترغیب دی ہے کہ بچوں کے ٹی وی دیکھنے کے دورانیے کو روزانہ صرف ایک گھنٹہ کر دیں تو یہ چیز والدین کو دھکا لگانے میں مددگار ثابت ہوگی۔''

(Marie winn(2002) the plug- in drug)

اسی طرح جب نیویارک سٹی کے ایک مشہور نرسری سکول نے تمام بچوں کے والدین کو ایک خط جاری کیا جس میں انہیں ہدایت کی کہ اپنے بچوں کے ٹی وی کو روزانہ ایک گھنٹے سے تجاوز نہ کرنے دیں تو اسکول کے اس قدم کو والدین نے بہت سراہا۔ ایک ماں نے نیویارک ٹائمز کو بتایا:

"The letter gave me the final push into curtailing television

(اس خط نے مجھے ٹی وی کو بند کرنے کے لئے حتمی بہانہ دے دیا)

ایک دوسری ماں نے جو اپنے تین سال کے بچے کی ٹی وی اور کمپیوٹر گیمز سے محبت کے آگے مجبور ہو چکی تھی، نیویارک ٹائمز کو بتایا:

''میں اپنے بچوں کے آگے بہت پریشر میں تھی اس لئے جب خط آیا تو مجھے سکون ملا کیونکہ میں نے اپنے بچے کو بتایا کہ تمہارا اسکول نہیں چاہتا کہ تم ٹی وی یا کمپیوٹر کے آگے بیٹھو۔''

۶۔ بچوں کو سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس سے بچائیں

والدین کو چاہیے کہ وہ خود بھی اور اپنے نوجوان بیٹوں بیٹیوں کو بھی سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس (Twitter, Facebook) کے نشے سے بچا کر رکھیں۔

2010ء کے اوائل میں فیس بک کو استعمال کرنے والوں میں چالیس فیصد کی عمریں 25 برس سے کم تھیں۔ یعنی فیس بک استعمال کرنے والوں کی اکثریت نوجوانوں کی تھی مزید برآں، فیس بک کے سروے کے مطابق ٹین ایجرز میں سے 58 فیصد کی رائے یہ تھی کہ فیس بک اور ٹوٹر جیسی سوشل ویب سائٹس پر اپنی تصاویر پوسٹ کرنے میں کوئی خطرہ نہیں۔

نوجوانوں اور بڑوں کو فیس بک جیسی ویب سائٹس کا ایسا نشہ ہوتا

ہے کہ انہیں اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ اُن کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔

ابھی حال ہی میں Assoctiated press نے یہ خبر شائع کی ہے کہ امریکی ریاست کولوریڈو کے شہر گریلی (Greeley,Colorado) میں ایک عورت فیس بک پر گیم کھیلنے میں اتنی محو ہوئی کہ اس کا 13 ماہ کا بچہ باتھ روم میں ٹب میں نہاتے ہوئے ڈوب کر مر گیا۔ ڈسٹرکٹ جج تھامس کوامین (Judge Thomas Quammen) نے اُس عورت کو 10 سال قید کی سزا سنائی۔

"Mom on Facebook sentenced in son,s drowning death "

(April 15,2011)Associated Press (news.yahoo.com)

عدالتی رپورٹ کے مطابق 34 سالہ شینن جانس (Shannon Johnson) نے 20 ستمبر 2010ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے اپنے 13 ماہ کے بیٹے کو باتھ ٹب میں نہانے کے لئے چھوڑا اور خود دوسرے کمرے میں فیس بک پر ویڈیوز اور تصاویر share کرنے status update کرنے اور کیفے ورلڈ گیم کھیلنے کے لئے چلی گئی۔ کافی دیر کے بعد وہ واپس باتھ روم میں گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ اس کا بیٹا باتھ ٹب میں مرا ہوا اوندھے منہ پڑا ہے۔

وہاں کے مقامی اخبار The Greeley Tribune کے مطابق جج نے عورت کو دس سال کی قید سناتے ہوئے کہا:

" You left this little boy in a bath tub so you could entertain yourself on the computer by playing games"

(تم نے اس چھوٹے سے بچے کو باتھ ٹب میں صرف اس لئے اکیلا چھوڑ دیا تا کہ تم کمپیوٹر پر گیمز کھیل کر تفریح حاصل کر سکو)

یہ فیس بک کا نشہ نہیں تو آخر کیا ہے جو ایک ماں کی ممتا پر بھی غالب آ گیا!

۷۔ مشینی اساتذہ سے ہوشیار رہیں

آخر میں والدین کو یہ نصیحت ہے کہ اپنے بچوں کو اسلام کا حقیقی علم سکھانے کے لئے اسلامی علماء سے رجوع کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ نوجوان حضرات انٹرنیٹ سے اسلامی کتب اور علماء کی تصاویر down load کر سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ علم مکمل نہیں ہوتا۔

علم کی یہ خاصیت ہے کہ یہ انسانوں سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ کام مشینیں کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کمپیوٹر کو اس کام کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی اساتذہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے ہم اس کے ساتھ استاد کی صداقت علمیت اور کیریکٹر کو بھی جانچتے ہیں۔ یہ چیز کمپیوٹر سے حاصل شدہ علم کی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ انٹرنیٹ کی علمی شاہراہ (Information highway) پر یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ یہ علم کس حد تک مستند (authentic) ہے۔ امام شافعی کا قول ہے: مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا فَلْيُدَقِّقْ لِكَيْلَا يَضِيعُ دَقِيقُ الْعِلْمِ

(بحوالہ: اَلْاَنْسَابُ الْمُتَّفِقَہ۔ ابن طاہر المقدسی، صفحہ 3)

"تم جو بھی علم سیکھنا چاہو تو اس کو اچھی طرح چھان پھٹک کر حاصل کرو تا کہ علم کی روح (خلاصہ) ضائع نہ ہو یہ علم کی نیچر ہے کہ اگر اُسے چھان پھٹک کر نہ حاصل کیا جائے اور اگر اسے انسانی استاد سے نہ حاصل کیا جائے تو شاید علم تو حاصل ہو جائے لیکن اُس علم کی روح ضائع ہو جاتی ہے۔

کمپیوٹر جیسی مشینیں کثرت معلومات تو مہیا کر سکتی ہیں لیکن وہ اخلاقیات، آداب (ettiquettes) اور انسانیت نہیں سکھاتیں جو صرف علم کے نور سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک نے فرمایا تھا:۔

لَيْسَ الْعِلْمَ كَثْرَتَ الرِّوَايَاتِ وَلَكِنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ قَذَفَهُ اللهُ بِقَلْبِ الْمُؤْمِنْ

"علم صرف معلومات کی کثرت کا نام نہیں بلکہ علم ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ڈالتا ہے۔"

☆☆☆

اے غارِ ثور

ہے غاروں میں تیری جدا سب سے شاں
تری اونچی نیچی سی گہرائیاں

تو اے ثور! ٹھہرا ہے ہجرت نشاں
عقیدت سے بھرپور پہنائیاں

سیہ پتھروں کا ہے تیرا بدن
چمٹ کر نبیؐ کے کفِ خاک سے

اگر چہ چڑھائی تری ہے کٹھن
رسولِ مبیںؐ کے لبِ پاک سے

رفاقت رسولؐ مواخات کی
کلامِ ہدایت وہ سننے لگیں

ترے بختِ روشن کو ایسی ملی
گلِ رحمت و فضل چننے لگیں

جسے وقت ہر گز نہ دھندلا سکے
رہا تین دن میزبانِ نبیؐ

نہ چہرے پہ کوئی بھی میل آ سکے
تو اے خوش نگر رازدانِ نبیؐ

بنا مستقر مہبطِ وحی کا
تجھے جاہ و عزت دوامی ملی

ہے خوش بخت دامانِ عظمت ترا
قیامت تلک نیک نامی ملی

کیا صاف ابوبکرؓ صدیق نے
ہے خوش بخت کس قدر تیرا دروں

ترا چپہ چپہ بڑے شوق سے
جہاں اتریں آیاتِ امن و سکوں

تری خفتہ قسمت معاً جاگ اٹھی
دلِ منتظر کی ہے یہ آرزو

کریں گے وہؐ آرام تجھ پر ابھی
نظر آئے اِک بار مجھ کو بھی تُو

جو ایمان و ایقاں کی معراج ہیں
تری گھاٹیاں یہ بھی اِک دن چڑھے

ہر اک خیر و خوبی کے سرتاج ہیں
عقیدت سے ''اللہ اکبر'' کہے

رپورتاژ

غزل

ایک چہرہ مری نگاہ میں ہے
کوئی یوسف ہے اور چاہ میں ہے
دل میں رہتا ہے ایک ماہ جبیں
میرادشمن مری پناہ میں ہے
آنکھ بھی دیکھنے کی مجرم ہے
دل بھی شامل اسی گناہ میں ہے
اِک مروت بھی ہے تغافل میں
اِک محبت بھی انتباہ میں ہے
چاند کی چاندنی سے ظاہرہے
کسی سورج کی جلوہ گاہ میں ہے
اُس سے تکرار سود مند نہیں
فائدہ جو بھی ہے نباہ میں ہے
لاکھ ڈھونڈو کہیں نہیں ملتا
لطف جو دو دلوں کی چاہ میں ہے
اُس کی جانب بڑھے گی خود منزل
وہ مسافر ابھی جو راہ میں ہے

کرامت بخاری

اے میری جائے اماں

میری دھرتی!میری اماں!
میری سہیلی! میری ماں!
میری خوشیوں کا محور
میرے درد کا توُ درماں
لوٹ آئے تیری شادابی
ٹلے مصائب کا طوفاں!
ماتھے کا ہر داغ مٹے
اُجلا ہو تیرا داماں
رہے ترا دھانی پرچم
سب سے اونچا اور تاباں
ہرے بھرے ترے کھیت رہیں
تیرے دریا رہیں رواں
اس دنیا میں حشر تلک
تو آباد رہے جاناں!

شمیم فاطمہ

غزلیہ

چھلک جاتے ہیں، وہ ساغر نہیں ہیں
ہم اپنی ذات سے باہر نہیں ہیں

چلن بدلا ہے اب کے دشمنوں نے
اب ان کے ہاتھ میں خنجر نہیں ہیں

بنا رکھا ہے صحرا کو ٹھکانہ
خدا کا شکر ہے بے گھر نہیں ہیں

محبت کے ، وفا کے ، الفتوں کے
ہمیں اب وہ سبق ازبر نہیں ہیں

ہوا کے آج کچھ تیور نئے ہیں
دیئے جلنے سے پہلے بجھ رہے ہیں

نگاہوں کے عجب ہی زوایے ہیں
کہ قربت میں بھی پنہاں فاصلے ہیں

ہیں خود محتاجِ سنگِ یک نفَس وہ
جو آئینے کہ مجھ پر ہنس رہے ہیں

زمیں محور پہ اپنے تھم گئی ہے
مرا کمرہ ہے میں ہوں رت جگے ہیں

طارق محمود طارق

غزل

رات دن بس یہ کاروبار کروں
تیری اِک اِک ادا کو پیار کروں

چاہتوں کی صلیب پر چڑھ کر
دل جگر جان سب نثار کروں

رات تاریکیوں میں ڈوب چلی
صبحِ نو کا اب انتظار کروں

اُن سے ملنا ہو گر قیامت میں
تا قیامت میں انتظار کروں

صبحِ اُمید و شام غم اپنی
عارض و زلف پر نثار کروں

سوزِ دل میں نہ کچھ کمی آئی
کب تک آنکھوں کو اشکبار کروں

حُسن چھپ جائے جب نگاہوں سے
موسمِ گُل کا انتظار کروں

زخم دل کا چھپانا ہے مشکل
اب گریباں کو تار تار کروں

اُن کی معصوم آرزو پہ شہودؔ
حاصلِ زندگی نثار کروں

شہود ہاشمی

کھِل گئی دل کی کلی

ماں باپ نے تو چاؤ لاڈ سے نام نورین رکھا تھا لیکن گھر والوں نے نورین سے نونی اور پھر نینے بنا دیا۔سکول جانے تک اسے قطعی علم نہیں تھا کہ اس کا اصل نام کیا ہے۔گھر بھر میں طرح طرح کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچتیں۔

''نینے ذرا پانی تو پلانا خوب ٹھنڈا سا۔''

''نینے بیٹا بھاگ کر دروازے پر تو دیکھو کون آیا ہے۔گھنٹے سے بیل ہو رہی ہے۔''دادی جان اسے آواز لگاتیں۔

''نینا کی بچی یہاں کیا کر رہی ہو چلو جاؤ اپنی عمر کے بچوں سے کھیلو.....''ثمرین آپی اسے ڈانٹ کر کہتیں،ایک اور آواز سنائی دیتی۔

''نینا..... نینا بی دو سموسوں کی پلیٹ تو لا دو چٹنی زیادہ ساری ڈلوانا۔''یہ چٹخوری آپا ہوتیں۔

نینا،نینے،اری نینا،نینا کی بچی جیسے الفاظ سنتے سنتے اس کا سکول میں پہلا دن آ گیا۔نئے کپڑے نئے جوتے،نیا بیگ،نیا یونیفارم،نئی پونیاں.....''ارے واہ یہ تو بالکل ننھی پری لگ رہی ہے۔''ثمرین آپی نے اس کا ماتھا چوما۔

عنبرین عرف چٹخوری آپا بھی اس کے پاس آئیں اور بہت سی ہدایات دیں۔

''وہاں رونا بالکل نہیں۔سارے بچوں سے گھل مل کر رہنا الگ تھلگ بچے بالکل اچھے نہیں سمجھے جاتے .....اور مس جو بات سمجھائیں خوب دل لگا کر یاد رکھنا۔''

امی کی انگلی پکڑ کر وہ بالآخر سکول پہنچ گئی۔

بہت بڑا سارا سکول تھا۔چاروں جانب لڑکیاں ہی لڑکیاں..... دوڑتی بھاگتی،لائن میں چلتی.....وہ ایک دم مرعوب سی ہو گئی۔

آفس میں امی کافی دیر اس کی تعریفیں کرتی رہیں۔اس کی بڑی بہنوں کا اچھا تعلیمی ریکارڈ ان کے گوش گذار کیا۔بڑے سے شیشو والی عینک لگائے ایک بھاری بھرکم خاتون نے موٹا سا رجسٹر کھولا اور پوچھا اس کا نام کیا ہے۔

امی نے جواب دیا''نورین اقبال۔''

یہ نینے کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اسے اپنے نام کا پتہ چلا۔اپنا نام اس کے کانوں کو بھلا سا لگا۔

☆.....☆.....☆

پچاس ساٹھ بچوں کی کلاس میں جب اس کا نام بولا جاتا وہ پہلے سے منتظر ہوتی۔اپنا نام کسی اور کے منہ سے سننا کتنا اچھا لگتا ہے۔بدقسمتی سے اس کا نام نینے اس سے پہلے سکول پہنچ گیا تھا،کلاس فیلوز میں وہ نینے ہی تھی ہاں رول کال کے وقت اس کا اصلی نام شان بان سے سنائی دیتا.....روزانہ.....!

جب تک اس کا نام نہ پکارا جاتا اس کا ننھا منا ذہن کئی طرح کی خیالی کھچڑی بناتا۔

آج جب ٹیچر اس کی رول کال لیں گی وہ کہے گی پریزنٹ پلیز۔

کبھی سوچتی،یہ تو ساری لڑکیاں کہتی ہیں وہ کہے گی

یس ٹیچر۔

ٹیچر حیران ہو کر دیکھیں گی یہ پریزنٹ پلیز کی بجائے آج''یس ٹیچر''کس نے کہا ہے.....لڑکیاں جواب دیں گی نورین اقبال نے۔

لیکن ایسے نہ ہوتا،لڑکیاں نینے سے ہی کام چلا لیتیں،خدا جانے نورین کا لفظ ان کے حلق سے برآمد ہونے میں کامیاب کیوں نہیں ہوتا تھا؟

بڑے بھیا کی اور ثرمین آپی کی شادی ایک ساتھ ہوئی بلکہ بڑے بھیا کے ولیمے کے کھانے میں ثمرین آپی کی بارات بھی شامل ہوگئی۔ نینے اب نویں کلاس کی طالبہ تھی۔ بہت پڑھاکو نہ بہت ڈل بس درمیانی سی۔ اور درمیانے بچے کب نظروں میں آتے ہیں!

☆.....☆.....☆

بڑے بھیا اور ثمرین آپی کے بچے بھی شادیوں کی طرح آگے پیچھے دنیا میں آئے.....پہلی بار پھوپھو اور پہلی بار خالہ.....

اس نے تہیہ کیا تھا کہ بچے بولنے پر آئیں گے تو نورین خالہ، نورین پھوپھو کہلوائے گی۔ پیارے پیارے معصوم بچوں کے منہ سے اس کا نام کتنا اچھا لگے گا.....!! وہ خیالوں میں یہی سوچ کر خوش ہوتی رہتی۔

جس اس کی بھانجی فائقہ نے اسے، کھالہ.....کہا تو اس نے اس کا منہ چوم لیا۔

''جی خالہ کی جان.....خالہ نہ کہو، نورین خالہ۔ نونی کھالہ۔ نونی کھالہ.....فائقہ تالی بجا کر ہنسی لو جی نونی کھالہ سے نینے خالہ بننے میں زیادہ عرصہ نہ لگا۔ اور رہا اس کا بھتیجا ابراہیم وہ تو پکا پکا نقل چور بندر تھا۔ بڑوں سے سن سن کر طوطے کی طرح گردان شروع کر دیتا۔

نینے پھوپھو، میری پھوپھو۔ نینے پھوپھو، میری پھوپھو۔ نورین نے دو چار دفعہ، اصلاع کی کوشش کی مگر آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

تعلیم مکمل ہونے کے بعد اس نے دو چار چھوٹے موٹے کورسز کئے۔ گھر داری سیکھی۔ اسی اثناء میں ایک دو رشتے آئے۔ ان میں سے نسبتاً ایک اچھے رشتے کو بڑے بھیا نے شرف قبولیت بخشا۔ منگنی اور شادی میں تین ہفتے تھے۔ منگنی کی انگوٹھی پہناتے ہوئے ساس نے اسے خوب پیار کیا۔

ماشاءاللہ نام کی طرح میری بیٹی خوب پیاری ہے۔ نورین اندر تک خوش ہوگئی۔ اللہ نے چاہا تو نینے سے نورین کا سفر بہت جلد اختتام پذیر ہوگا۔ مہندی کی رات جب اس کی ماموں زاد، پھوپھو زاد، اور دیگر دوست احباب ہلے گلے میں مصروف تھیں اسکی ایک تیز طرار کزن نے ببانگ دہل اسے مخاطب کیا۔

''نینے جی آج کی تاریخ، دن، مہینہ، سن خوب اچھی طرح حفظ کر لو۔

''ہائیں وہ کیوں.....؟ نینے نے پوچھا''

''اس لئے بی بنو کہ ہر عورت کے لئے اس کی شادی کا دن ایک دائمی کیلنڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تمہیں نہیں یاد سب شادی شدہ خواتین کسی کے مرنے جینے پر کیا کہتی ہیں!

جب میری شادی ہوئی تو فیروز پندرہ دن کا تھا۔ جب میری شادی ہوئی تو بے بے جی کے انتقال کو دس ماہ ہو چکے تھے۔ میری شادی سے بارہ دن پہلے زلزلہ آیا تھا وغیرہ وغیرہ.....!

ہنس ہنس کر ساری محفل گل وگلزار بن گئی اور بہت سی دیگر سوچوں کے ساتھ ایک سوچ بڑی روشن تھی۔

نیا گھر، نئی زندگی، نیا انداز، نورین اقبال!

☆.....☆.....☆

رخصتی کے بعد اسے کھلے سے برآمدے میں بٹھایا گیا۔ درجن بھر بچے اس کے اردگرد بیٹھے تھے کوئی سامنے کھڑا تھا اور کوئی دائیں جانب۔ اس کی چھوٹی نند ثوبیہ اس کا تعارف کروا رہی تھی۔ چیکو بیٹے یہ آپ کی نینا مامی ہیں، پنکی، سلام کرو، نینا چچی کو۔

اوئے تابو ادھر آؤ، نینا بھابھی سے نہیں ملیں، نورین کے دماغ پر دھم دھم ہتھوڑے بجنے لگے۔ یہ کیا ہوا! پھر نئے رشتے کی بنیاد بننے پر تھی اور نینے کی آنکھوں سے چھل چھل پانی بہہ رہا تھا۔

ہائے، زندگی میں کوئی اسے نورین کہنے والا نہیں ملے گا؟

ذہن میں دھماکہ سا ہوا۔ ارے اصل شناخت کرنے والا تو باقی ہے.....اس کا شوہر.....ایسے کروں گی کہ ان کی آمد پر دونوں ہاتھ جوڑ کر ایک ہی درخواست کروں گی ''سرکار مناسب سمجھیں تو آپ ہی نورین کہہ لیا کریں۔''

☆.....☆.....☆

ام ایمان

زیور

''اے جہاں آرا! دلہن کب آئے گی؟'' مہر جہاں نے فکر مندی سے بہن سے پوچھا۔

''مہمان آ چکے ہیں۔ بارات آئے ہوئے بھی آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے، آخر کون سی تیاری کروا رہے ہیں بیوٹی پارلر والے جو مکمل ہو کے نہیں دیتی.....''

''مہر آپا! میں خود پریشان ہوں لوگوں کے جوابات سوالات ختم نہیں ہو رہے ختم بھی کیسے ہوں دلہن آئے تو ختم ہوں .....سلامت اور جاوید دونوں سے پوچھ چکی ہوں کہتے ہیں منیر میاں کو بھیجا ہے شاید ٹریفک میں پھنسے ہوئے ہیں۔''

''دلہن آ گئی دلہن آ گئی.....''

شور اٹھا۔ جہاں آرا اور مہر جہاں دونوں نے مسکرا کر سکھ کا سانس لیا۔ لمبا سا گھونگھٹ ڈالے دلہن سرخ قالین سے گذرتی ہوئی اسٹیج تک پہنچی سہیلیاں اور بہنیلیاں گھیرے ہوئے تھیں۔ بھابھیوں نے سنبھال کر سیڑھی کے تین زینے طے کرائے اور صوفے پر بیٹھا دیا۔ سرخ لباس اور اس پر خوبصورت کام کی چمک اور خوبصورتی دور سے ہی نظر آ رہی تھی۔ بھابھی نے گھونگھٹ ہلکا سے ہٹا کر چہرہ اوپر اٹھا دیا بڑی بھابھی نے اسٹیج سے اتر کر دادی اور ساس کو ڈھونڈنے کے لئے ہال کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

اسٹیج کے بائیں طرف بیٹھی ہوئی دادی اور اُن کی بہن آہستہ آہستہ اٹھنے اور دلہن کے پاس آنے کے لئے پر تول ہی رہی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جسمانی اعضاء حرکت میں آنے کیلئے خاصا وقت لینے لگتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر سہارا.....اسٹیج پر جانے کے لئے راستے میں کتنی ہی اونچ نیچ آتیں ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گر کر ہاتھ پاؤں تڑوا بیٹھیں۔

''لیکن اُن کے اٹھنے سے پہلے ہی بڑی بھابھی اُن کے پاس پہنچ گئیں دادی جی! بڑا غضب ہو گیا۔'' بڑی بھابھی نے دھیمے لہجہ میں کہا

''کیا ہوا بیٹا!''

''اماں جان کہاں ہیں؟ انہیں معلوم ہو گا تو سارا غصہ مجھ پر ہی اتاریں گی۔''

''کیا ہوا بیٹا؟ کچھ پتہ تو چلے.....''

بھابھی کے دھیمے لہجے کے باوجود ارد گرد میزوں پر بیٹھی خواتین کے کان کھڑے ہو چکے تھے۔

''دادی بی! بیوٹی پارلر میں ہم لوگ زیور لے کر گئے تھے۔ میں نے تھیلا چادر کے نیچے رکھا تھا۔ لیکن میک اپ کے بعد جب زیور پہنانے کے لئے چادر اٹھائی تو زیور کا تھیلا غائب تھا۔''

دادی بی منہ کھولے پوت بہو کو دیکھ رہی تھیں۔ بات ابھی تک اُن کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن ارد گرد کی میزوں پر بیٹھی عورتوں کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ کچھ کی نظریں دلہن کی طرف اٹھی ہوئی تھیں کچھ دلہن کی ساس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ کچھ جلد باز خبر کا سرا تھام کر لوگوں کو تھمانے کے لئے اٹھ چکی تھیں۔

''اے بہو! کیا کہہ رہی ہو دلہن تو آ چکی ہے.....''

دادی کے خیال میں جب دلہن آ چکی ہے تو زیور تو لازم اُس نے پہنے ہی ہوں گے۔ یہ بہو پتہ نہیں کیا دیوانگی میں بک رہی ہے۔

''دادی بینا کو ہم نے بیوٹی پارلر والوں سے لے کر نقلی زیور پہنائے ہیں۔''

''کیا.....کیا کہہ رہی ہے تو؟''

''ہاں دادی کیا کرتے دلہن کو لے کر تو آنا تھا نا!''

''تو وہ لاکھوں کے زیور وہ چوڑیاں وہ نورتن کا سیٹ.....'' دادی تو جیسے بے ہوشی میں بول رہی تھیں۔

''ہائے اکبر نے کتنے جتن سے زیور کا پیسہ اکٹھا کیا تھا۔''

دادی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہیں بین ڈال دیتیں۔

''دادی اب یہ سوچئے کہ امی جان کو یہ کیسے بتایا جائے پھر بینا کی ساس!''

دادی کو افسوس کے ساتھ ساتھ ایک پریشانی بھی شروع ہوگئی لیکن اب معاملہ بڑا نازک آن پڑا تھا۔ زیور تو گئے سو گئے نیا رشتہ کمزور نہ پڑے ہائے بہو تو نے دھیان کیوں نہ رکھا؟ ضرور خود بھی لیپا پوتی کرانے بیٹھ گئی ہوگی۔ دادی نے بہو کو گھورا۔

''سارا قصور تمہارا ہے۔ زیور اپنے پاس اپنے قبضے میں رکھنے تھے یا چادر کے نیچے ڈال کر اطمینان سے بیٹھ جانا تھا جیسے لاکر میں رکھ دیئے ہیں۔''

''اماں اب کیا کروں جو ہونا تھا سو ہو گیا..... ابھی تو معاملے کو سنبھالیں..... بعد میں میں شاکر سے کہہ کر بینا کو اور زیور بنوا دوں گی۔''

''ہونہہ..... اور بنوا دوں گی.....'' دادی نے بہو کا ہاتھ غصے سے جھٹکا..... اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

''چلیے میں آپ کو لے جاتی ہوں امی جان کے پاس۔''

بہو نے دوبارہ دادی کا ہاتھ تھاما۔ اب کے دادی نے اس کو پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ اسٹیج کی طرف چل دیں جہاں خبر رساں خواتین پہلے ہی بینا کی ساس تک خبر پہنچا چکی تھیں اور وہ اسٹیج پر بینا کے برابر بیٹھی اُس کے زیورات کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

بینا کا حال سب سے خراب تھا۔ میک اپ کے باوجود چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ کاٹو تو لہو نہیں.....

اسٹیج اور اسٹیج سے نیچے کھڑی تمام خواتین کی نظریں بینا کی ساس پر تھیں۔ ساس کو بغیر زیور سونے کے بہو قبول ہے یا.....

''بہن بری کا زیور بڑا بھاری تھا۔ چار چوڑیاں پھر جھمکے اور گلے کا ہار بہت وزنی تھا دو تین لاکھ تو یقیناً تھے۔ پھر منگنی کی انگوٹھی اور ٹیکہ لڑکے والوں کا دیا زیور ہی چار لاکھ سے کم نہ ہوگا۔''

چھوٹی بھابھی کی چچی کی نند نے اپنی بھابھی کے کان میں کھسر پسر کی۔

''ارے بری کا ہی نہیں میکہ کا زیور بھی بڑا بھاری تھا۔ ان کی چھوٹی بہو کے میاں سلیم نے بہن کو پورا چار تولے کا سیٹ دیا تھا..... ہاہ ہائے یہ کیا ہو گیا.....'' کھسر پسر بڑھ کر اچھی خاصی واویلا میں تبدیل ہو چکی تھی۔ دادی اسٹیج پر آ کر ساس کے برابر بیٹھ گئیں۔

''بہن اگر آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہے تو اس حادثے کے بعد ہم آپ سے بڑے شرمندہ ہیں۔ آپ سے اس سلسلے میں وعدہ کرتے ہیں کہ جتنے وزن کے زیور تھے ہم بعد میں بنوا کر اسے چڑھائیں گے۔''

بینا کی ساس جو ابھی تک بینا کو انتہائی غور سے دیکھ رہی تھیں دادی کی بات پر چونک سی گئیں۔

اسٹیج کے بائیں جانب باتیں کرنے والی دو خواتین کی آواز آئی جو سناٹے میں ہر ایک کو سنائی دی۔ کہہ رہی تھیں۔

''بنو معاملہ سادہ نہیں ہے۔ ہمیں تو کوئی چکر لگتا ہے..... پارلر والے اگر ایسی حرکت کرنے لگیں تو کون اُن کے ہاں جائے گا۔''

''ارے نہیں خالہ بی دھوکے بازی کرنے والے تو فوراً وہ جگہ اور علاقہ ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ کہیں اور اپنا پارلر کھول کر شروع ہو جائیں گے۔

''بی بنو! پارلر کے شوق نے ہی سارا ستیاناس مارا ہے۔ کھال کنچھوا کر بال نچوا کر ہنس بننے کا شوق نہ ہو تو کوئی مسئلہ ہی نہیں..... دیکھو تو دلہن کا میک اپ ہزاروں میں کیا گیا ہوگا..... لیکن بینا بچی سادگی میں کیسی پیاری لگتی تھی اب بھلا لگ رہا ہے کہ یہ وہ بچی ہے۔''

''خالہ کو پارلر کے خلاف بولنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ خالہ بی آپ تو بس..... اب لوگوں کی لاپروائی کا الزام بھی پارلر کے سر کر دیں۔''

''بچی! الزام نہیں حقیقت ہے۔ پیسہ پانی میں پھینکنا ہی تو ہے..... عقل مند ہو تو اس واقعے سے عبرت پکڑو..... اگلے ماہ فروا کی شادی ہے''

خالہ کیسے چھوڑ دیتیں! ان کا پسندیدہ موضوع تھا یہ۔

اسٹیج پر بیٹھی خواتین اور نیچے کھڑی ہوئی سب ہی معاملے کی نزاکت اور لوگوں کے تبصروں سے گھبرائی ہوئی تھیں۔ لیکن کان اور آنکھیں دونوں ہی بینا کی ساس کی طرف متوجہ تھے۔ جو بینا کی دادی کا ہاتھ تھام کر کہہ رہی تھیں۔

''خالہ جان جو حادثہ ہوا.....اب ہو گیا.....لکیر پیٹنے سے اپنی ہی لاٹھی ٹوٹنے کا خدشہ ہے۔ اللہ کا شکر مالک نے عزت اور جان محفوظ رکھی۔ زیور اور سونا سب میرے بیٹا بہو پر صدقے گیا۔ اللہ اور دے گا.....آپ فکر نہ کریں مجھے تو اپنی بہو کے لئے حسنِ سیرت اور حیا کا گہنا ہی کافی ہے۔''

ساری فکر مند خواتین نے سکھ کا سانس لیا۔ شادی کا پنڈال جس کو سانپ سا سونگھ گیا تھا دوبارہ خواتین کی باتوں کی کچ کچ، ہنسی کی کِل کِل اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سے گونجنے لگا۔

نگہت یاسمین

پسِ آئینہ کوئی اور ہے

اسماء دو دن سے عینی اور ایمان کے سکول کی ورکشاپ کے بارے میں اسد کو بتا رہی تھی مگر وقت تو پر لگا کر اڑتا ہے کہ ہفتہ کی صبح آن پہنچی۔ عین وقت پر بارش نے بھی ہنگامی صورتحال پیدا کر دی۔ بھاگتے دوڑتے روانگی ہوئی۔ وہاں پہنچ کر ہال کے چاروں طرف پانی ہی پانی دیکھا تو بے ساختہ منہ سے نکلا۔

''شہر کو پیرس بنانے والے تو پیرس جا بسے۔'' بدقت تمام کیچڑ پونچھتے، جھاڑتے استقبالیہ پر اپنا اندراج کروایا اور اپنی مخصوص نشست پر ٹک گئی ارد گرد کی خواتین سے کچھ معلومات کا تبادلہ ہوا۔ ہال کی آدھی نشستیں پر ہوئیں تو پرنسپل مسز سارا نے اپنے سکول کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور مائیک، ملٹی میڈیا مس ہالہ کے حوالے کئے۔ دھیمے مگر پُر اعتماد لہجے میں تعارف کے بعد آغاز ہوا۔

''اگر ہمیں کسی جگہ فیکٹری لگانی ہو تو سب سے پہلے جگہ کا انتخاب کرتے ہیں اگر مقام صحیح ہو تو پیداوار میں خلل نہیں آتا! درست اور بروقت ہوتی ہے اگر کائنات پر نظر ڈالیں تو عورت پروڈکشن سائیٹ ہے۔ یعنی کمزور ہستی کے سپرد دنیا چلانے، نظام ہائے حیات سنبھالنے والوں کی تخلیق، پیدائش اور تربیت کی گئی''

''.....عورت نازک ہے! جذباتی ہے! مگر کائنات کے مالک نے اس کو ذمہ دار بنایا تخلیق اور تربیت کا آسمان سے کسی مشین کو نہیں اتارا کہ بچے ڈھل کر نکلیں یا مرد کو ماں نہیں بنایا کہ مضبوط ہے غیر جذباتی ہے، جسمانی اعتبار سے ناقص عورت کو اشرف المخلوقات کی تیاری کا بے انتہا نازک اور اہم کام تفویض کیا .....''

کبھی کبھار کسی ننھے منے کی آواز ہال میں ارتعاش پیدا کرتی تو شرکاء مائیں چونک جاتیں۔ سب اپنی حیثیت کے بارے میں جان کر بڑی مطمئن سی لگ رہی تھیں کہ گفتگو تلخ حقائق تک آ پہنچی۔ بحث کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ مس ہالہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھیں گویا ایک ایک لفظ تُل رہا تھا۔

''.....سرمہ نے سرمہ پسینے والے سے پوچھا، تم مجھے اتنا کیوں پیستے ہو؟ سرمہ پیسنے والے نے جواب دیا، تمہیں اشرف المخلوقات کے جزوِ اشرف یعنی آنکھ میں جذب ہونا ہے۔

تو اگر اشرف المخلوقات کے ایک جزو میں جذب ہونے کے لیے اتنی گھسائی، پسائی ضروری ہے تو اس کی تخلیق اور تربیت کس قدر مشقت اور صبر کی متقاضی ہے.....''

''اُف'' کچھ خواتین نے اپنی نشستوں پر پہلو بدلے۔ کچھ اپنی گھڑیوں میں وقت دیکھنے لگیں۔ نکات ہی ایسے تھے کہ نظریں چرانے پر مجبور ہو گئیں ''اختیارات، احتساب کے بغیر نہیں عطا کیے گئے.....''

اسما سن کر دل ہی دل میں کھول رہی تھی .....''ہوں آخر یہ سب باتیں عورتوں کو کیوں سنائی جاتی ہیں؟ مرد حضرات نے بڑے آرام سے خود کو معاش تک محدود کر لیا ہے۔ بچوں کو ببل گم، چپس کے پیکٹ پکڑائے، گالوں پر پیار کیا اور دوسری نوکری کے بہانے گھر سے نو دو گیارہ! گویا گھر نہیں پکنک اسپاٹ ہے! تو عورت کا سخت احتساب کیوں کر ہو سکتا ہے؟''

ملٹی میڈیا بند کرتے ہوئے مس ہالہ نے اختتامی کلمات کہے، ''.....مگر دعا اثر رکھتی ہے! دعا معجزہ کرتی ہے! ماں کی دعا اولاد کے لئے.....''

سوال و جواب کا سیشن نہ ہونے پر مس سارہ نے معذرت کی کیونکہ ورک شاپ تو صرف دو گھنٹے کی تھی مگر نا گہانی بارش کے باعث دیر

سے شروع ہوئی اور مرد حضرات جو اس دوران بچوں کو سنبھال رہے تھے اب ہال کے باہر لینے آ چکے تھے۔

''.....واہ کیا بات ہے!! ماں تو سارا دن دیکھ بھال کرے لیکن آفس کے باہر کھڑی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر ماں چوبیس گھنٹوں میں تھکن کا اشارہ بھی کر دے تو تان کو الٹی ٹائم پر آٹوٹتی ہے.....آہ معاشرے کے کرتا دھرتا عورت کو اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ ماں کی چوبیس گھنٹے کی کارکردگی کو کوالٹی ٹائم کے اسکیل پر کیوں جانچا جاتا ہے؟ اسما دانت پر دانت جما کر بڑبڑائی تو آگے پیچھے خواتین مڑ کر دیکھنے لگیں۔

ان سوچوں کو ایک طرف کرتے ہوئے اسما نے جلدی سے رکشا لیا اور گھر کی طرف رواں دواں ہوگئی۔ اترتے ہی ٹیپو، عینی اور ایمان نے گھیرے میں لے لیا۔ تجسس آنکھوں سے عیاں تھا۔ ''امی کیا ہوا تھا؟''

''کچھ خاص نہیں میرے بچو!'' اسما نے انہیں لپٹا لیا۔ ان معصوموں کا معاشرے میں عورت اور مرد کے درمیان چھڑی حقوق و فرائض کی بحث سے کیا واسطہ؟ بچے تو قدرت کا تحفہ ہیں.....کائنات کا حسن! مرد و زن اپنی انا کی خاطر اس بیش قیمت تحفے کی ناقدری کر رہے ہیں۔

اگلے دن صبح سویرے عینی کی کلاس فیلو کی والدہ نصرت کا فون آ گیا'' آپ چلیں نا.....تقریباً پکی ہے آپ کی نوکری! آپ جیسی قابل خاتون گھر نشین ہو جائے تو.....'' رکے بغیر بولے چلی گئی۔

گذشتہ ذہنی مشق کا اثر تھا کہ اس نے شام تک کا وقت سوچنے کے لئے لیا۔

''بس آپ اسی وقت ہاں کر دیں! اب تو چھوٹا بچہ بھی اسکول جانے والا ہے۔ چند دن تو ہیں سیشن شروع ہونے میں.....'' نصرت کا اصرار بتا رہا تھا کہ ہوم ورک خوب کیا ہے۔ چنانچہ اسے اسد سے مشورہ کیے بغیر ہاں کرتے ہی بنی۔

☆.....☆.....☆

شام میں اسما نے کھانے کے ساتھ میٹھا بھی تیار کر لیا کہ سب شوق سے کھاتے تھے۔ رات کھانے کی میز پر اسد کی پلیٹ میں کھانا ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

''سوشل ورکر مسز احسان کی سیکرٹری کی جگہ خالی تھی۔ وہ میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ پک اینڈ ڈراپ کی سہولت ہے۔ دو چار دن ٹیپو کو ساتھ لے جاؤں گی پھر اس کا اسکول شروع ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں اخراجات بھی بڑھیں گے'' یوں اطلاع کا مرحلہ طے ہوا۔ اسد نے تھوڑی ردو کد کے بعد ماسی کے بغیر گھر چلنے کی شرط پر بات مان لی۔

''میں گھر میں اور باہر اپنی کارکردگی ثابت کروں گی۔'' اسماء نے اپنا عزم دل میں دہرایا۔

دن مہینوں میں بدل گئے۔ اس نے اپنی ذہانت اور قابلیت سے بہت جلد اپنی جگہ بنا لی۔ مسز احسان کا سوشل ورک تھا کہ شیطان کی آنت! لاتعداد خواتین اپنے مسائل کے ساتھ ان کے دروازے پر جمع رہتیں۔ اتنے پیچیدہ معاملات ہوتے کہ سلجھنے میں نہ آتے ایک عورت کے لئے چھت اور روزگار کا بندوبست ہوتا تو مزید تین خواتین قطار میں آ کر کھڑی ہوتیں۔ دو سوکنوں کا معاملہ تو ناقابل یقین سا تھا جنہوں نے مل کر شوہر کو قتل کر دیا تھا اور بہنا پے کے طور پر الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ گو کہ سزا تو دونوں کاٹ رہی تھیں مگر اب تعلقات معمول پر تھے۔ واقعی عورت کیا نہیں کر سکتی!!

گھر اور بچے ایک دوسرے کے حوالے ہوئے تو دونوں کا جغرافیہ بدلنے لگا۔ زندگی سے بھرپور تین جیتے جاگتے بچے!! ننھا ٹیپو چیزوں کو سہولت کے لئے اپنے ہاتھ کے فاصلے پر رکھتا۔ توتھ پیسٹ کتابوں کی شیلف پر اور موزے کھلونوں کی ٹوکری سے برآمد ہوتے۔ اسد زیر لب بڑبڑاتے، کبھی جھنجھلاتے۔ اسما تھکی ہاری گھر میں داخل ہوتی تو اپنی دانست میں جلدی جلدی کام نبٹاتی کہ کچھ وقت آرام کا مل جائے مگر وائے افسوس.....اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ اس کے محض چھ گھنٹے باہر رہنے سے گھر کو بھونچال کا سامنا کیوں تھا؟ گھر کی آمدنی میں ایک معقول اضافہ بھی تو ہوا تھا ساتھ ہی نئی سہولیات بھی۔

کبھی وہ ستم رسیدہ بے گھر عورتوں کی حالت زار یاد کرتی تو دوسرے لمحے اپنی قابل رحم حالت پر کڑھتی مگر خود کو ثابت کرنا اتنا آسان تو

نہ تھا بچوں کو اسکول کا کام کروانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اب سر پکڑے، جمائیاں لیتے، عورتوں کے مسائل اور ان کے حل سوچتے ہوتا تھا۔ گھر کسی مددگار کے بغیر کب تک چلتا؟ بالآخر ایک جز وقتی ملازمہ رکھنی پڑی۔ اس کی تنخواہ کے علاوہ روز فرمائشی پروگرام پر اسا جُز بُز ہوتی۔ بچوں کی خراب ہوتی کارکردگی کا حل اس کی نظر میں ایک اچھے استاد کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر پھر اچھے مشاہرے کا سوچ کر دانتوں پسینہ آ جاتا۔ گزشتہ ہفتے ایک تقریب میں اپنے بچوں کو کھانے کی قابوں اور کولڈ ڈرنک پر چھینا جھپٹی کرتے دیکھا تو اس منظر نے اسماء پر گھڑوں پانی ڈال دیا۔

''..... چیزوں کی کثرت کے باوجود یہ رویہ.....بس میڈیا کا اثر ہے، سارے بچے ایسا کر رہے ہیں.....'' اس نے خود کو تسلی دی۔ حالانکہ اس کی ساری بچت گھر سے باہر کھانا کھانے، بچوں کے نئے نئے شوق پورے کرنے میں صفر ہو جاتی مگر بچوں کی عدالت سے باعزت بری ہونے کا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ دوہری ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے، خود ترحمی اور خود ترحمی کے مابین ڈولتی اسماء کی زندگی میں بالآخر وہ لمحہ آن پہنچا جس کی تڑپ نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

مسز احسان نے ہنگامی نشست میں اعلان کیا ''صدارتی تمغۂ برائے حسن کارکردگی کے لئے اسماء اسد کی نام زدگی ہماری تنظیم کے لئے باعث فخر ہے'' تو اسماء کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اپنی ساتھیوں کی ستائشی نظروں کی زد میں تھی۔

''.....کاش امی زندہ ہوتیں! میری ساری کامیابیاں ان کے دیئے ہوئے اعتماد کی مرہون منت ہیں.....'' اس کے علاوہ بولا نہ گیا ''مگر کیا وہ خوش ہوتیں مجھے اس حال میں دیکھ کر؟'' کسی نے جیسے اس کے دل میں چٹکی سی لی اور واقعی اسکی امی، نانی، پرنانی اور سگڑ نانی تک تمغوں، شناخت سے محروم گھروں میں بند بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کی زندگی گزار گئیں۔

کل شہر کے پنج ستارہ ہوٹل میں پرتکلف ہال میں منعقدہ تقریب کے لئے پورے ملک سے خواتین مدعو ہیں۔ اسماء گھنٹوں کے مساج اور فیشل کے بعد ملائم چہرہ اور کھلی کھلی رنگت لیے گھر میں داخل ہوئی ہے۔ بچے اور اسد اس کا روپ دیکھ کر متاثر ہیں۔

''.....مجھے تمہارے پوشیدہ جوہر کی خبر ہی نہ تھی.....'' اسد کی آنکھیں اعتراف کر رہی تھیں۔

تیاری کے مراحل میں اسماء ادھوری تقریر چھوڑ کر بوتیک کے کپڑوں میں سے کل پہننے کا جوڑا چننے دوسرے کمرے میں گئی تو عینی نے کاغذ اٹھا کر بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔

''..... بلا شبہ آج کی عورت وہ سب کچھ کر سکتی ہے جو مرد کرتا ہے۔ میری پہچان میری کارکردگی ہے جو کسی طرح ایک مرد سے کم نہیں.....''

گولڈن رنگ کا سوٹ پہن کر اسماء آئینے کے مقابل کھڑی ہوئی تو وہ خود کو پہچان نہ سکی مگر اس کا عکس کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے پسندیدہ شاعر فلسفی خلیل جبران کا قول اس کے ذہن میں گونجا

"The personality of the other person lies not in what he reveals to you, but what he connot rveal to you, therefore if you unedrstand him, listen not to what he says but rather what he does not say"

نامہ اعمال لکھنے والے فرشتے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ قدیم فکر کے حامل فلسفی کی یاد کو اسماء کے حق میں اچھا شگون خیال کیا اور نتیجے کا اعلان آنے والے وقتوں کے لئے اٹھا کر رکھ دیا۔

عظمیٰ عمران

لگن

ماسی صغراں عرصہ 19 سال سے ہمارے گھر کام کر رہی ہے 19 سال کی مدت بہت ہوتی ہے مگر ماسی جیسی پہلے دن ہمارے گھر آئی تھی ویسی ہی آج بھی ہے..... چہرے پر اتنی جھریاں جیسے بنجر زمین میں پڑی دراڑیں ..... منحنی سا وجود ..... سر کے بال کھچڑی جن سے ہمیشہ مکھن یا دیسی گھی کی باس آتی ہے ۔ ماسی نے اپنی طویل مشقت بھری زندگی میں فاقے تو بے شمار کیے ہوں گے لیکن سر میں لگانے کو گھی کا بندوبست ہر طرح کے حالات میں جاری رکھا ۔ موٹے شیشوں کی عینک جو ایک کپڑے کو بل دے کر بنائی گی رسی کے ساتھ بندھی اُس کے گلے میں لٹکتی رہتی تھی ..... پاؤں میں قینچی چپل ، کپڑے بوسیدہ مگر صاف ستھرے ۔ رفتار اور حرکات میں بے حد تیز مگر مزاج کی ٹھنڈی ۔ ہم اکثر اُسے چھیڑتے کہ ماسی تم جلد بوڑھی ہوگئی تھیں یا اب تمہارے بڑھاپے کو بریک لگا ہوا ہے جو تم ویسی کی ویسی ہی ہو!

ماسی صغراں بے حد نیک اور تہجد گزار عورت ہے ۔ بتاتی ہے کہ میں رات تین گھنٹے سے زیادہ نہیں سو سکتی چاہے رات کتنی ہی لمبی ہو۔ فجر سے بہت پہلے جاگ کر تہجد کے کم از کم بارہ نفل ادا کرتی ہے ۔ پھر ڈھائی سپارے پڑھتی ہے ۔ پھر فجر کی اذان کے بعد نماز اور اذکار ۔ دس ہزار دانوں کی تسبیح بنا رکھی ہے ۔ ایک تسبیح نکال کر وہ کام پر جانے کو تیار ہو جاتی ہے ۔ ناشتہ اکثر نہیں کرتی کہ عادت نہیں ہے ۔ دن کے دس گیارہ بجے اگر بھوک لگے تو جو مل جائے وہ کھا لیتی ہے..... اگر اُس وقت کھالے تو پھر دوپہر کو نہیں کھاتی ۔ کہتی ہے کہ اتنی بار کھاؤں تو معدہ ہضم نہیں کرتا ۔ کھانے کے لئے کبھی اپنے منہ سے نہیں مانگتی ۔ ہم لوگ اُس کو پوچھتے ضرور ہیں ۔ طلب ہو تو لے لے گی ورنہ انکار کر دے گی ۔ کبھی پوٹلی میں باندھ کر گھر نہیں لے گئی کہ گھر میں اُس کے سوا ہے کون ۔ سب بچے شادی شدہ اور اپنے گھروں والے ہیں ۔ ہر پیر اور جمعرات کو ماسی روزہ رکھ لیتی ہے ۔ جس دن روزے سے ہو بڑی خوش وخرم ہوتی ہے کہ آج کھانے کی فکر سے آزاد ہوں ۔ شوال ، محرم اور ذوالحج کے روزے کبھی قضا نہیں کئے ۔

ماسی صغراں کام بہت پھرتی سے کرتی ہے ۔ گھر داخل ہوتے ہی یوں لگتا ہے کہ جیسے اس میں بجلیاں بھر گئی ہوں ۔ جھاڑ پونچھ کر رہی ہے تو ساتھ ساتھ اگلے کام کی فکر اُسے ستاتی ۔ صابن کاٹ کر چولہے پر ساتھ ہی ابلنے رکھ دیتی ۔ ہم سب کو ساتھ ساتھ کہتی جاتی کہ اپنے کپڑے نکال کر واشنگ مشین کے پاس رکھ دو بس میں مشین لگانے ہی والی ہوں ۔ کپڑے دھو رہی ہوتی تو اس سے اگلے کام کی فکر ۔ ہم اس کی پلاننگ اور ٹائم مینجمنٹ دیکھ کر حیران رہ جاتے ..... ایک اور عادت اس کی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کام کرتے ہوئے کچھ گنگناتی رہتی ہے ۔ بعض اوقات گھنٹوں ایک ہی لفظ دہراتی لیکن اتنی آہستہ آواز میں کہ میں کبھی نہ جان سکی کہ وہ کیا گنگناتی ہے ایک دن میں نے اُس سے پوچھ ہی لیا ماسی ! آج مجھے ضرور بتاؤ تم کیا گاتی رہتی ہو..... میرے پوچھنے کی دیر تھی کہ ماسی کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی ۔ بیٹا تم نہ پوچھو..... اس کی حالت دیکھ کر میں بھی خاموش ہوگئی ..... میں نے سوچا کہ اسے ضرور کوئی غم ہے جسے ہلکا کرنے کیلئے ہر وقت اتنے سوز سے گاتی ہے..... نہ معلوم کسے یاد کرتی ہے ۔

آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ ماسی کو جہاز بہت پسند ہیں کہیں اخبار میں تصویر دیکھ لے تو ٹھٹھک جاتی ہے ۔ جہاز کے گذرنے کی آواز سنتے ہی باہر بھاگتی ہے اور بچوں کی طرح خوش ہوتی ہے ہاتھ ہلاتی ہے ..... اُس کے گنگنانے میں تیزی آجاتی ہے اور چہرے پر

سرشاری کی کیفیت۔ضرور اس کا کوئی پیارا پردیس میں ہے، میں اکثر سوچتی۔

ماسی کے دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔سب کی شادی کر چکی ہے۔ایک بیٹی جلد بیوہ ہوگئی تھی،اس کی چاروں بیٹیوں کو بھی ماسی نے پالا اور اُن کی بھی شادیاں کیں۔اتنے بڑے کنبے کی ہر خوشی غمی کو بہت خوش اسلوبی سے نبھالیتی ہے۔ہمارے ہاں کبھی چھٹی نہیں کرتی۔بیٹے اب ماں کا گھروں میں کام کرنا پسند نہیں کرتے لیکن ماسی کا کہنا ہے کہ جب تک میرے ہڈ پیر سلامت ہیں کسی اور پر بوجھ بننے کو دل نہیں چاہتا۔اکیلی ایک کمرے میں رہتی ہے جس میں ایک ٹرنک، چارپائی اور چند برتنوں کے سوا کچھ نہیں۔ایک دن وہ کام میں مصروف تھی۔جتنا تیز گاتی، اتنا ہی ہاتھوں کی حرکت تیز ہو جاتی۔یوں لگتا تھا کہ یہ ردھم اُس میں پٹرول بھر رہا ہے۔میں نے ایسے ہی پوچھ لیا..... ماسی تمہیں کسی سے محبت تو نہیں تھی جس نے تمہیں چھوڑ دیا ہو؟ وہ بے ساختہ میری طرف پلٹی، خدا نہ کرے وہ مجھے چھوڑے!اور پھر وہ تھی اور آنسوؤں کی جھڑی.....اور میں تھی اور افسوس کی ایک لہر کہ میں نے اُس سے ایسا کیوں پوچھا!

ماسی نے جب ہمارے گھر کام کرنا شروع کیا تھا تو پہلی تنخواہ سے ہی امی کے پاس کمیٹی ڈال لی تھی''باجی لاکھ پورا کرنا ہے پھر لوں گی۔''لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ کبھی بیس ہزار، کبھی تیس، وہ جمع شدہ رقم لے جاتی۔ہم ہنستیتھے کہ اتنے برس بیت گئے اُس کی لاکھ روپیہ جمع کرنے کی خواہش پوری نہیں ہوئی اور پتہ نہیں وہ اتنی رقم کا کیا کرے گی!اس بار اس نے پچانوے ہزار کر لئے تھے۔دو قسطوں میں لاکھ پورا ہو جانا تھا کہ صبح سویرے اطلاع آئی کہ ماسی فوت ہوگئی ہے۔ہمارے گھر میں ہر کوئی اشک بار تھا۔وہ تو ہمارے گھر کے فرد کی طرح تھی۔اتنی محبت والی، سیدھی سادی.....''امی میں بھی آپ کے ساتھ اس کے گھر چلتی ہوں''میں نے امی کی رضامندی پر جلدی سے چادر اوڑھ لی۔

وہاں پہنچے تو ماسی کی بیٹیاں اور بہوئیں اس کی چارپائی کو گھیرے بیٹھی تھیں اور وہ اپنے جھریوں بھرے چہرے پر مسکان سجائے گہری نیند سو رہی تھی۔اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن یہ مسکراہٹ بھی ہمیشہ کی طرح اداسی لئے ہوئے تھی آہ!میں ماسی کا غم نہیں جان سکی!

میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ماسی کی نواسی میرے قریب آ بیٹھی اُس نے باتوں کے دوران بتایا کہ ماسی کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے عشق تھا۔وہ ہر سال حج کے لئے درخواست جمع کرواتی تھی اور کمیٹی بھی حج کے لئے ہی ڈالی تھی مگر کبھی کسی کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات اور کبھی کسی کے بچے کی بیماری پر کمیٹی توڑ لیتی۔محلے ہی کے کئی لوگوں کی زبانی آج معلوم ہو رہا تھا کہ وہ وقت بے وقت اُن کی مدد کر دیا کرتی تھی۔اللہ نے مجھے اپنے گھر تو بلانا ہی ہے.....اس سال نہ سہی اگلے سال.....ایسے موقع پر وہ کہتی۔

ہر سال حج کا موسم قریب آتا تو آنکھوں میں سرمہ ڈالنے لگتی کہ اس سے بینائی اچھی ہو جاتی ہے آخر روضۂ رسولؐ کو دیکھنا ہے۔پاؤں بے حد صاف رکھتی اور کبھی ایڑیاں میلی نہ ہونے دیتی کہ ان پیروں نے اللہ کے گھر کا طواف کرنا ہے۔خوراک بے حد کم تھی لیکن حج کے قریب مہینوں میں پائے پکوا کر کھاتی کہ پائے کھانے سے جوڑ مضبوط ہوتے ہیں آخر غارِ حرا اور غارِ ثور کی بلندیوں کو پہنچنا ہے!کئی میل روزانہ پیدل چلتی تا کہ صفا اور مروہ کی سعی خود بھاگ بھاگ کر کر سکے..... حج کی تمام دعائیں یاد کر رکھی تھیں۔جہازوں سے اسے اس لئے لگاؤ تھا کہ اسے معلوم تھا جہاز پر بیٹھ کر ہی وہ خانہ خدا تک جا سکتی ہے۔

''اور وہ گنگناتی کیا تھی''.....میں نے بے ساختہ اس کی نواسی سے سوال کیا۔

''محمدا.....محمدا.....محمدا.....محمدا.....!''ماسی کی نواسی بالکل اس کے انداز میں گنگنانے لگی۔

''اس کے ٹرنک سے دو کپڑوں کے جوڑے، احرام، جہاز میں بیٹھ کر کانوں میں رکھنے کے لئے روئی کے پھاہے، کنکریاں ڈالنے کے لئے سلی ہوئی پوٹلی اور پچانوے ہزار روپے نکلے جو وہ چند دن پہلے ہی امی سے لے آئی تھی۔اس بار قرعہ میں اس کا نام نکل آیا تھا اور رقم بھی

اس نے پوری کر لی تھی ۔ کہتی تھی انیس سال ہو گئے آس لگائے ..... اس سال میرا رب مجھے ضرور بلا لے گا اور اللہ نے اسے بلا ہی لیا!'' یہ کہتے ہوئے اس کی نواسی نے اپنے آنسو پونچھے۔

ماسی کی زندگی کا وہ باب جواب تک سربستہ تھا آج مجھ پر آشکار ہو گیا تھا۔ اُس کا غم ،اس کی محبت کا راز فشا ہو گیا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ روپیہ پیسہ ہمارے آگے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے مگر ہم حج کے لئے شاید بڑھاپے کا انتظار کرتے ہیں ۔ ہماری ترجیحات میں گھر، گاڑی، زیور، کاروبار اور بچوں کی ضروریات جیسی لمبی لسٹ ہوتی ہے ۔ حالانکہ رب کے گھر کی زیارت کے لئے شاید ہمیں نہ تو ویسی مشقت کرنی پڑے نہ ویسا انتظار.....جیسا ماسی صغراں نے کیا.....مگر بات تو لگن اور لو لگانے کی ہے.....!

☆☆☆

حمیرا خالد

ایک حقیقت ایک فسانہ

آخر یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا.....؟ نسیمہ بیگم نے چلّاتے ہوئے کہا۔ کیا یونہی گھر گھر کی خاک چھانتے رہیں گے۔ بیٹی بیاہنا آسان ہے پر بہولانا جوئے شیر.....نسیمہ بیگم کا تجربہ تو یہی کہہ رہا تھا۔ ان کے مختصر سے گھرانے میں اگرچہ ایک بیٹا اور بیٹی ہی تو تھے۔ بیٹی بچپن میں ہی خالہ نے اپنے بیٹے کے لیے مانگ لی تھی اور کم سنی میں ہی وہ وداع کر کے لے گئی تھیں۔ بہن اور بہن کا معاملہ تھا۔ نہ تکلف نہ تواضع، نہ فکر نہ اندیشے سب کام خوش اسلوبی سے ہو گئے .....اب بیٹے کی دلہن لانے کا وقت آیا تو سارے ارمان جاگ گئے۔ گھر میں بیٹی کا وجود تو اسی رشتہ سے جنم لیتا ہے۔ آنے والی کے مزاج سے سارا ماحول بدل جاتا ہے۔ اب جس کے ساتھ پل پل کا ساتھ ہو وہ دل کو ہی نہ بھائے تو عمر کیسے گزرے۔ نسیمہ بیگم اس معاملے میں بے حد محتاط اور زیرک خاتون تھیں۔

ابھی کل ہی تو ایک گھر میں جانا ہوا تھا۔ کیا وسیع وعریض لان تھا۔ پھول ہی پھول .....گھر کی سجاوٹ، اہل خانہ کے لطیف ذوق کا پتہ دے رہی تھی۔ خاتون خانہ بے حد حلیم الطبع اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ مہمان کی خاطر و مدارت کا بھی خوب ڈھنگ رکھتی تھیں۔ اچھی مہذب تعلیم یافتہ اور خوش شکل بچی کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا..... اپنا شایان بھی تو کسی سے کم نہیں ہے۔ نسیمہ بیگم نے دل ہی دل میں تقابل کیا۔ لیکن بچی کی تعلیم ہی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات نسیمہ بیگم کو قابل قبول نہیں تھی۔ لہٰذا بات آگے بڑھانے کا کیا فائدہ!

چائے کی چسکی لیتے ہوئے انھوں نے برملا اظہار کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ خاتون خانہ کے ماتھے پر سوچ کی کتنی ہی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ پھر بھی انھوں نے انتہائی خوشدلی سے مہمان کی آؤ بھگت کی کہ یہ ان کا فرض اور نبیؐ پاک کا فرمان ہے کہ مہمان کے قدم گھر میں برکتیں لے کر آتے ہیں۔

نسیمہ بیگم کا گاہے بگاہے کسی نہ کسی گھرانہ میں آنا جانا رہتا۔ اور یہ گویا ان کا حق تھا کہ رشتہ کرنے سے پہلے ہر ہر پہلو سے اچھی طرح اطمینان کر لیا جائے۔ ڈھیروں گھروں کی خاک چھاننے کے باوجود کوئی بچی ان کے معیار پر پوری نہیں اتر رہی تھی۔ کبھی کبھار ضمیر کی چبھن انھیں بے چین کر دیتی۔ لیکن وہ اپنے آپ کو حق بجانب ٹھہرا لیتیں کہ یہ تو زمانے کا دستور ہے تو اس میں برا کیا.....لیکن اس چلت پھرت سے وہ غیر محسوس طور پر دل پر ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگی تھیں۔

اس کیفیت کا اظہار وہ اپنی دیرینہ دوست کے سوا کسی سے بھی نہ کر پاتیں۔ کیونکہ وہی ان کی ہم خیال اور ہر کام میں شریک مشورہ تھیں۔ ورنہ میاں صاحب تو ایک جملہ کہہ کر بات ختم کر دیتے اور بیٹا ماں کی دل پسند مصروفیت سمجھ کر لطف لیتا رہتا۔

بیٹی اپنے گھر کی تھی اسے کہاں فرصت کہ ماں کے ساتھ ماری ماری پھرے۔ گھر میں بہولانا کوئی معمولی فیصلہ تو نہیں تھا مگر صلاح دینے والے سب بے نیاز تھے۔ نسیمہ بیگم اپنی دوست کے سہارے اس اہم مشن پر گامزن تھیں۔

وقت تھا کہ سرپٹ بھاگے جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شایان میاں خیر سے ۲۹ سال کے ہو چکے تھے اور وہ ابھی تک کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پائی تھیں۔

تمھاری پریشانی درست ہے پر حوصلہ رکھو اللہ بہتر ہی کرے گا۔

دوست نے تسلی دینا چاہی۔خوابوں کو حقیقت بنانا بھول ہے یہ وہ بھی خوب جانتی تھی۔کہیں نہ کہیں سمجھوتہ تو کرنا ہی ہوگا۔

تقدیر لکھنے والے نے ہر چیز کا وقت لکھ دیا ہے۔آخر کار وہ وقت بھی آ ہی گیا جب شایان میاں کی دلہن نسیمہ بیگم کے گھر کا اُجالا بن کر آ گئی۔یوں گویا خوشیوں کی برکھا برس پڑی ہو۔

چند دنوں میں ہی شایان میاں کا بجھا بجھا سا چہرہ ماں کی نظروں سے چھپا نہ رہ سکا۔پہلے پہل تو یہی سمجھا کہ تھکاوٹ اور مہمانداری کی وجہ سے طبیعت کی کسلمندی ہے لیکن آخر کب تک.....

شایان میاں کے اس بدلے بدلے رویہ سے تشویش بڑھی تو رہا نہ گیا۔میاں سے رازداری سے گویا ہوئیں۔

دیکھ رہے ہو شایان میاں کچھ اکھڑے اکھڑے سے نہیں لگ رہے.....

تمھارا وہم ہے کچھ کام کیا کرو ورنہ تمھارا خالی ذہن یونہی تانے بانے بنتا رہے گا۔بے نیازی سے دیے گئے جواب سے وہ ذرا بھی مطمئن نہ ہوئیں۔

تم بھی ذرا دھیان دیا کرو گھر کے معاملات میں کب تک مہمان بنے رہو گے۔انھوں نے برجستہ جواب دیا۔

اچھا یہ بتاؤ بہو تو اچھی لگی.....اور کیوں نہ اچھی ہو.....دلہن کی تعریف کریں یا اپنی بیگم کی،سب کچھ ہی تو ڈھونڈ نکالا ہے۔خوش شکل، تعلیم یافتہ اور پھر تمھاری دلی آرزو اعلیٰ منصب پر کام کرنے والی کماؤ بہو.....اور کیا چاہیے۔تمھارے تو سارے خواب پورے ہو گئے۔ نسیمہ بیگم کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔کتنا ہی شکر کروں اپنے رب کا کم ہے میرے بیٹے کا مقدر ہی شاندار تھا۔

اور تمھارا مقدر بھی۔میاں نے لقمہ دیا۔نسیمہ بیگم واقعی مطمئن ہو کر خوش کن تصورات میں کھو گئیں۔

چار دن میں آنے والی دلہن شیما سب سے مانوس ہو گئی تھی۔ اور پھر آتے ہی آفس جانا.....تو گھر میں مل جل کر بیٹھ رہنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ہفتہ بھر میں ایک چھٹی آتی تو یوں ہلچل میں گزر جاتی کہ نہ میاں نہ ساس سسر کسی کو بھی ٹائم نہ دے پاتی۔سب ہی تشنہ رہ جاتے۔اکثر صبح آفس جاتے ہوئے شایان کو ناشتہ دینے کی ہدایت کرتے ہوئے وہ بڑی ادا سے ساس ماما کو لپٹا کر بڑی بے تکلفی سے پیار کرتی۔اور بھاگتے بھاگتے کہتی جاتی، مام شایان کو اچھا سا بریک فاسٹ دے دینا مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔او کے مام ٹیک کیئر!

نسیمہ بیگم ابھی آنکھیں کھول کے اس بے باکی کو سمجھنے کے قابل بھی نہ ہوتیں کہ شیما کی گاڑی فراٹے بھرتی جا چکی ہوتی۔

ایک انٹرنیشنل فرم میں اعلیٰ عہدہ پر فائز شیما کی مصروفیات رفتہ رفتہ گھر میں کم اور باہر زیادہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

شایان اپنی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کے لیے اب بھی ماں ہی کو پکارتا کہ شیما کے پاس وقت ہی کہاں تھا۔جتنی بڑی تنخواہ اتنی ہی مضبوط غلامی کی زنجیریں۔چار و ناچار کولہو کے بیل کو تو گھومنا ہی ہے۔

مام میں دیر سے گھر آؤں گی شایان سے کہیے گا وہ ویٹ نہ کرے۔ڈنر مجھے باہر ہی کرنا ہوگا بہت امپورٹنٹ ڈیلیگیشن آ رہا ہے .....آئینہ کے سامنے بالوں کو برش کرتے ہوئے اس نے ساس ماما کو بتانا ضروری سمجھا۔

نسیمہ بیگم ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی صورت بنی یہ بدلتے طور طریقے نبھائے چلے جا رہی تھیں۔شایان کی آواز پر چونک گئیں نجانے کب سے قمیص ہاتھ میں لیے پکار رہا تھا، ماما بٹن تو لگا دیں۔

ماں کا دل تڑپ اٹھا، میرا بچہ کتنا تنہا ہے.....اندر سے آواز آئی، اس نے تو اپنی زندگی کا ساتھی چننے کا اختیار مجھے سونپ دیا تھا، اس ماں کو جو اپنے بچہ کی گود خوشیوں سے بھر دینا چاہتی ہے..... ہاں یقیناً میں نے بھی اپنے شایان کے لیے بہت سوچ سمجھ کر ہیرا چنا ہے۔ کتنی قابل ہے میری بہو.....اعلیٰ ملازمت، خوبصورت، خوش مزاج .....اب یہ توقع کرنا کہ گھر داری بھی کرے ظلم ہے۔انھوں نے انصاف سے سوچا۔یہ سارے کام تو اچھی تنخواہ پر ملازم رکھ کے بھی کیے جا سکتے ہیں۔انھوں نے دل کو سمجھایا۔

شایان کی معنی خیز مسکراہٹ اور ان کے بوڑھے ہاتھوں کی

کپکپاہٹ بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ان کے آنگن میں کھلنے والے شگفتہ پھول کی نگہبانی کیا یہ کمزور ہاتھ کرسکیں گے۔اسی لیے تو اللہ نے جوان والدین کو نوجوانی میں اولاد پالنے کی مشقت دی تھی ورنہ ضعیفی یہ بوجھ کہاں سنبھال سکتی تھی۔

ماما کا نہیں اپنے بچے کا تو سوچو! شایان نے پہلی دفعہ غصے سے برملا شیما کو مخاطب کیا.....وہ ماما کی ذمہ داری تو نہیں.....

اس کا بچہ جو سیڑھیوں سے لڑھک کر ایسا گرا کہ ناک سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔دادی کی چیخ پکار اسے کہاں بچا پاتی۔لڑکھڑاتے قدم کہاں تک ساتھ دیتے۔شیما نے ٹیلیفون رکھتے ہوئے گلوگیر آواز میں شایان کو سمجھانا چاہا۔تم کیا جانو آفس کے معاملات! کتنی مشکل ہو رہی ہے چھٹی لینے میں .....آفس والے ممتا کے رشتوں کو جانتے ہیں نہ مانتے ہیں۔انھیں صرف اور صرف وقت پر کام چاہیے اور اس کے لیے وہ بہت بڑی قیمت ادا کرتے ہیں۔یہ تم بھی خوب جانتے ہو۔

بچہ کو ہسپتال میں داخل ہوئے آج دوسرا دن تھا۔چوٹ لگ جانا تو معمولی بات تھی مگر بروقت احتیاطی اقدام نہ کرنے کی وجہ سے معاملہ سنگین ہو گیا تھا۔

ہسپتال کے اسٹاف کے باوجود ایک اضافی نرس کا انتظام بھی کر لیا گیا تھا جو ماں کی غیر موجودگی میں اس کمی کو پورا کر سکے۔

شیما زیادہ وقت بچے کے پاس ہی رہنا چاہتی تھی لیکن آفس کو وقت دینا بھی اس کی مجبوری تھی اگرچہ وہ خوب جانتی تھی کہ ماہر نفسیات کا تجزیہ بالکل درست ہے کہ پیدائش سے ڈھائی برس کی عمر تک بچوں کو کسی حال میں ماں سے جدا نہیں ہونا چاہیے۔یہاں تک کہ اگر بیمار پڑ جائے تو شفاخانہ میں بھی ماں کو تمام وقت اس کے نزدیک ہی رہنا چاہیے۔ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ جو بچے بیماری کی حالت میں اپنی ماؤں کی آغوش میں رہتے ہیں وہ جلد صحت یاب ہو جاتے ہیں۔اس نے بے ساختہ زور سے بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔دادی نے دم کیے ہوئے پانی کے چھینٹے مارے۔ندامت سے رب کو پکارا۔شایان نے بیچارگی کی نظر سے تینوں کو دیکھتے ہوئے اپنے رویہ پر حسرت سے سوچا۔کیا یہ اس کی فرمانبرداری تھی یا بے نیازی کہ جس کا انجام اسے دیکھنا پڑا تھا؟ اسی لمحہ موبائل کی مخصوص رنگ نے شیما کو متوجہ کیا.....جی سر بس دس منٹ میں، میں ابھی حاضر ہوتی ہوں.....میٹنگ سے پہلے ہی.....ڈونٹ وری۔

شیما نے بچے کو دادی کی جھولی میں ڈالا اور فرمانبردار غلام کی طرح آقا کی پکار پر بوجھل قدموں سے کمرے سے باہر چل دی۔بچے کے لیے تو دادی موجود ہی ہے نا جو ماں سے بڑھ کر شفقت اور محبت کرنے والی ہیں، اسے پورا اطمینان تھا۔

شایان اور اماں ایک دوسرے سے نظریں بچاتے ہوئے خوب جان چکے تھے کہ غلطی کہاں ہوئی ہے اور ذمہ دار کون کون ہے.....سکھ کے پیمانے جب نظام فطرت سے ٹکرانے لگیں تو انجام ایسا ہی بھیانک ہوا کرتا ہے۔

پنجرے میں بسیرا

وہ ایک مدت کے بعد چند روز کے لئے اپنے وطن آ رہا تھا۔ میں اس کا استقبال کرنے کے لئے ائیر پورٹ پر آیا تھا۔مگر بیرون ملک سے براہ راست آنے والی فلائٹ ایک گھنٹہ لیٹ تھی جس میں تھوڑی دیر بعد ایک گھنٹے کا مزید اضافہ کر دیا جاتا۔

میں جب بھی ائیر پورٹ پر آتا ہوں مجھے وہ دن بہت یاد آتے ہیں جب وہاں پر سکیورٹی اتنی سخت نہ ہوتی تھی اور ہم جانے والے عزیزوں کو بالائی منزل پر واقع گیلری میں کھڑے ہو کر قریب سے دیکھ سکتے اور انہیں جہاز کی طرف جاتے اور سوار ہوتے ہوئے آخری سیڑھی تک ہاتھ ہلا کر جواب دے سکتے تھے۔فرقہ وارانہ فسادات، لسانی تعصّبات اور سیاسی اختلافات کے عفریت ابھی پیدا نہ ہوئے تھے اور نہ ہی اسلام اور جہاد کو بد نام کرنے والی پاکیزہ ناموں اور کالے کرتوتوں والی دہشت گرد تنظیمیں ابھی وجود میں آئی تھیں۔لیکن ائیر پورٹ پر ہی کیا ان دنوں شہر میں بھی ناک میں دم کرنے والی ایسی ناکہ بندیاں نہیں ہوا کرتی تھیں جیسی اب ہیں۔

انتظار میں کھڑے کھڑے ٹانگیں شل ہو گئیں۔ویٹنگ ہال میں استقبال کرنے والوں کا ہجوم تھا اور ایک دوسری میں خلط ملط ہوتی آوازوں کا ایسا شور پھیلا ہوا تھا کہ قریب کھڑے شخص سے بھی بلند آواز میں بات کرنا پڑتی۔ایک تو گرمی کا موسم، پھر لوگوں کا ہجوم جس کی وجہ سے حبس میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔اگرچہ جگہ جگہ چھت کے پنکھے چل رہے تھے مگر وہ بھی گرم ہوا ہی پیدا کر رہے تھے۔اس کے باوجود آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں حبس سے پناہ لینے کی خاطر ان کے نیچے کھڑی تھیں۔سینکڑوں آدمی، عورتیں، بچے اور بوڑھے ایک دوسرے کی خارج کی ہوئی سانسوں میں سانس لے رہے تھے۔

میرا اس سے ای میل، ٹیلی فونک اور انٹرنیٹ رابطہ رہتا تھا۔وہ میرا دوست اور کلاس فیلو تھا اور ہم ایک عرصہ تک ایک ہی محکمے میں ہم کار رہ چکے تھے۔پھر دس برس کی سرکاری ملازمت کے بعد بھی سفارش یا رشوت کے بغیر ترقی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بد دل ہو کر ملک چھوڑ کر چلا گیا مگر میں اپنی گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے خواہش کے باوجود اس کا ساتھ نہ دے سکا اور مجبوراً اسی تنخواہ اور عہدے پر کئی برس تک کام کرتا رہا۔ان دنوں بیرونِ ملک جانے کا ایک راستہ بذریعہ کابل کھلا تھا۔ افغانستان میں نہایت خوشحالی اور امن وامان تھا اور کابل جانا اور وہاں سے دنیا کے کسی بھی دوست ملک کا ویزہ لگوانا آسان تھا۔اکثر لوگ شاپنگ کرنے اور ہندوستانی فلمیں دیکھنے جاتے رہتے تھے۔بعض صبح کو جاتے اور رات کو لوٹ آتے۔آڈیو وڈیو ریکارڈنگ کا کوئی آسان ذریعہ ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا، اس لئے ہمارے بہت سے فلمساز اپنے ساتھ منشی قسم کے رائٹرز لے جاتے جو ان کی پسندیدہ فلم دیکھ کر کہانی اور مکالمے قلمبند کر لیتے اور واپس آ کر ایک نئی چربہ فلم کا آغاز کر دیا جاتا۔ ملکی فلمی صنعت کے تحفظ اور قومی مفاد کے نام پر فلم انڈسٹری کے لوگوں نے انڈین فلموں کی درآمد پر پابندی لگوا دی تھی۔اس لئے بہت کم لوگوں کو پتہ چلتا کہ وہ قومی مفاد کے نام پر چربہ فلمیں دیکھتے ہیں۔

پرویز مختلف ملکوں میں قسمت آزمائی اور محنت مزدوری کرتا ہوا بالآخر ڈنمارک پہنچ گیا۔جب وہ اچھی طرح سیٹ ہو گیا اور اسے معقول پیسے ملنے لگے تو اس نے پاکستان میں اپنی ملازمت سے استعفیٰ بھیج دیا۔میں اس کی غیر حاضری میں اس کی فیملی اور محکمانہ معاملات کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔سال چھ ماہ بعد اس نے اپنے بیوی بچوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔لیکن میرے ساتھ اس کی خط کتابت اور دوستی کا رشتہ

قائم رہا۔اب میاں بیوی دونوں کام کرتے تھے اور اگرچہ وہاں ٹیکس بہت زیادہ تھے مگر اس کے باوجود ان کی ماہانہ آمدنی پاکستان کے حساب سے دواڑھائی لاکھ کے قریب تھی۔وہ خطوں میں مجھے اپنے حالات اور کوپن ہیگن کی معاشرت اور آزادی کے بارے میں تفصیل سے لکھتا رہتا۔ میں جواب میں اسے اپنے حالات ،محکمانہ معاملات اور ملک کے سیاسی اور سماجی حالات سے باخبر رکھتا۔کبھی کبھی اس کی فرمائش پر کوئی رسالہ، کتاب یا اخبار بھی بھیج دیتا۔مگر اب انٹرنیٹ پر اسے اردو اخبارات پڑھنے کو مل جاتے تھے۔

چند ہی برسوں میں پرویز بے حد خوشحال ہوگیا۔اس نے اپنے قریبی رشتہ داروں کی مالی معاونت میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔وہ وقتاً فوقتاً اپنے بہن بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کو بچوں کی تعلیم ، شادیوں ، زمین خریدنے یا کاروبار کو ترقی دینے کے لئے لاکھوں روپے کی مالی مدد دیتا رہتا۔لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے، وہ ان کے شر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ان کی ضرورتیں ،توقعات اور مطالبے بڑھتے ہی چلے گئے اور وہ کسی دوسرے کو اپنے سے زیادہ رقم ملنے پر حسد کرنے لگتے۔ پھر ایک بھائی نے پلاٹ کے لئے بھیجی گئی اس کی بہت بڑی رقم اپنے کاروبار میں لگا دی اور پلاٹوں کی قیمتوں میں عارضی اضافے کا بہانہ کر کے کئی برس تک ٹال مٹول کرتا رہا۔اس سلسلے نے طول پکڑا یہاں تک کہ دونوں کی اولادیں جوان ہوگئیں۔اب چھوٹے بھائی کی خواہش تھی کہ بیٹی کا رشتہ ڈنمارک میں سول انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کرنے والے بھتیجے سے ہو جائے لیکن پرویز اور اس کی بیوی پلاٹ کی رقم ہضم کر جانے کی وجہ سے خوش نہ تھے۔پرویز تو پھر بھی درگذر کرنے کو تیار تھا مگر اس کی بیوی اور بیٹے نے اس رشتے کو منظور نہ کیا اور بیوی نے پرویز کی بھتیجی کی بجائے اپنی بھانجی کو ترجیح دی جس پر چھوٹا بھائی اور اس کی فیملی ناراض ہوگئی۔اس کے باوجود جب شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی تو پرویز فیملی سمیت پاکستان آیا اور گھر والوں کو اپنے آبائی گاؤں بھیج کر ناراض بھائی اور اس کی فیملی کو منانے کی خاطر میرے پاس رک گیا۔

رات کو اس نے مجھے ساری تفصیل بتائی اور کہا کہ میں ثالثی اور صلح جوئی کے لئے اس کے ساتھ جاؤں۔اگلی صبح ہم دونوں اس کے چھوٹے بھائی کے ہاں جس نے پرویز کی رقم سے اپنے لئے ایف سیون میں پلاٹ خرید کر مکان بنا لیا تھا، پہنچے۔ہم نے گھنٹی بجائی تو وہ خود گیٹ پر آیا۔تھوڑے تامل کے بعد اس نے گیٹ کھول دیا لیکن صرف میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہنے لگا:

''اگر آپ ساتھ نہ ہوتے تو میں اس شخص کو جو آپ کے ساتھ آیا ہے،کبھی اندر آنے کی اجازت نہ دیتا۔''

میں کہنا چاہتا تھا کہ جو شخص اپنے سگے بھائی کا احترام نہیں کرتا وہ کسی دوسرے کو کیا عزت دے گا مگر پرویز نے مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو جسے اس نے اپنے گھر میں رکھا، پڑھایا لکھایا اور اس کی شادی کی تھی، بہت بڑی رقم ہڑپ کر جانے کے باوجود شادی میں شرکت پر راضی کرے اور دونوں گھروں میں کشیدگی ختم ہو جائے،اس لئے ہم اندر چلے گئے۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر بھائیوں میں بحث اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا جس میں چھوٹے کی بیوی بھی شریک ہوگئی۔دونوں میاں بیوی پرویز سے براہِ راست بات چیت کرنے پر بھی آمادہ نہ تھے، وہ ہر بات کا جواب مجھے مخاطب کر کے دیتے۔درمیان میں پلاٹ کے لئے بھیجی گئی رقم کا بھی ذکر ہوا جس پر وہی پرانا جواب کہ ہمیں کاروبار میں نقصان ہوگیا تھا لیکن ہم رقم کوئی کھا تو نہیں گئے ، واپس کر دیں گے۔رشتے کے معاملے پر میاں بیوی بہت برہم تھے جب انہوں نے اپنی ماں جیسی بڑی بھابھی کی شان میں غلیظ زبان استعمال کی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔مجھے حیرت ہوئی کہ پرویز کا رویہ اب بھی مدافعانہ اور صلح جویا نہ تھا مگر ان تلوں میں تیل نہیں تھا،ہم دونوں مایوس ہو کر واپس آ گئے۔ میں پرویز کو لوہے کا آدمی کہا کرتا تھا اور مجھے یاد تھا کہ پچیس تیس برس پہلے ایک بار رات کو وہ بیوی کے ساتھ راولپنڈی سے ٹیکسی کار میں اسلام آباد آیا تو طے شدہ کرایہ لیتے ہوئے ڈرائیور نے بھابی کو کوئی آوارہ عورت اور پرویز کو عیاش آدمی سمجھ کر انعام مانگا جس پر پرویز

نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ ڈرائیور نے بھی گاڑی سٹارٹ کرنے والا ہینڈل اٹھا لیا۔ دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔ گھر قریب ہی تھا بھابی دوڑتی ہوئی ہمارے ہاں آئیں اور ساری بات بتائی۔ میں جب وہاں پہنچا تو پرویز کے سر سے خون بہہ رہا تھا مگر وہ ڈرائیور کو اپنے نیچے دبوچ کر اس کی پٹائی کر رہا تھا۔ میں نے دونوں کو الگ کیا اور ڈرائیور کو پولیس کے حوالے کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر ڈرائیور کو اب تک اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا اس نے معافی مانگ لی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

مجھے حیرت ہوئی جب پرویز اپنی بیوی کی توہین برداشت کر گیا لیکن واپسی پر وہ مجھے زندگی میں پہلی بار آبدیدہ دکھائی دیا۔ لگتا تھا جذباتی صدمے کی تپش اتنی زیادہ تھی کہ اس کا سارا وجود پگھل گیا تھا۔

بعد میں اس نے بتایا کہ یہ برداشت، تحمل اور شائستگی اس نے دیارِ غیر میں جا کر سیکھی تھی جہاں بقول اس کے دس برسوں میں ایک قتل ہوا تھا جس پر سارے اخبارات کی شہ سرخیاں لہو رنگ ہوگئیں اور الیکٹرانک میڈیا نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ حکومت نے متعلقہ علاقے کی پولیس اور متعلقہ عہدے داروں کو معطل کر دیا کہ دو آدمیوں میں کشیدگی اتنی بڑھ گئی اور آپ کو خبر ہی نہ ہوئی۔ میں نے کہا کبھی ہمارے ہاں بھی جب سرخ آندھی آتی تھی تو کہا جاتا تھا کہ ضرور کہیں قتل ہوا ہے۔ لیکن اب ہم سب سفاک ہو گئے ہیں۔ صرف بارود سے بھری جیکٹیں پہننے اور دھماکے کرنے والے ہی دہشت گرد نہیں ہمارے درمیان بے شمار ایسے دہشت گرد موجود ہیں جن کے ذہنوں میں بارود بھرا ہے۔ جن سیالکوٹی منڈوں کے مکھڑے کے تل پر کبھی ہم فدا تھے انہیں اب ہم سرِعام ڈنڈوں سوٹوں سے مار مار کر ہلاک کر دیتے اور ان کی لاشوں کو گاڑی پر لاد کر شہر بھر میں پھراتے ہیں۔

اگلے روز وہ اکیلا اپنے آبائی گاؤں روانہ ہوگیا۔ کچھ روز بعد اس کے بیٹے کی شادی ہوگئی جس میں اس کے کسی بھائی نے شرکت نہ کی۔ کیونکہ ایک بھائی اٹلی میں تھا جسے پاکستان آنے کی فرصت نہ تھی اور سب سے چھوٹا دوسرے کے زیرِ اثر تھا۔ بہنیں اگرچہ شادی میں شریک ہوئیں لیکن اپنے زیرِ کفالت رہنے والے بھائیوں کے سلوک اور رویے سے وہ سخت بددل ہوا۔ تاہم گاؤں میں اس کی ضعیف والدہ بیوگی کی زندگی گزار رہی تھیں، وہ دوبارہ کبھی پاکستان نہ آنے کی قسم نہ کھا سکا۔

مگر نیک بخت والدہ نے اسے جلد ہی آزاد کر دیا۔ چھوٹا آخری دنوں میں علاج کے لئے انہیں اسلام آباد لے آیا تھا، جہاں وہ انتقال کر گئیں۔ پرویز کے بھائیوں نے فیصلہ کیا تھا کہ والدہ کو اسلام آباد میں ہی دفنایا جائے۔ پرویز کو اطلاع دی گئی تو وہ کسی نہ کسی طریقے سے ماں کا منہ دیکھنے اور اس کے جنازے میں شرکت کرنے کے لئے کراچی کے راستے لاہور پہنچ گیا مگر بدقسمتی سے یہ بیس بائیس برس پہلے کا اٹھارہ نومبر کا وہی تاریخی دن تھا جب عوام میں بے حد مقبول اور اب شہید، خاتون لیڈر نے وفاقی دارالحکومت میں پاکستان جمہوری اتحاد کے زیرِ اہتمام آمریت کے خلاف لانگ مارچ کا اعلان کر رکھا تھا اور اس مقصد کے لئے کسی نہ کسی طرح لیاقت باغ پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر پولیس نے لانگ مارچ روکنے کے لئے شہر کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ راولپنڈی اور اسلام آباد میں داخلے کے سارے راستے بند تھے یا سخت تلاشی اور جانچ پڑتال کی جاتی تھی اور بقول ایک مزاحیہ شاعر دوست کے شہر میں دفعہ دو سو اٹھاسی (2x144) لگی ہوئی تھی۔ دارالحکومت کے زیادہ تر حصوں پر شہرِ خموشاں کا گمان ہوتا تھا۔

پرویز کو پن ہیگن سے لاہور تو آسانی سے پہنچ گیا تھا لیکن اس کے لاہور سے اسلام آباد پہنچنے کے امکانات بہت کم تھے۔ ادھر چھوٹے بھائی کا کہنا تھا کہ ڈاکٹروں نے بیماری کی نوعیت کے پیشِ نظر میت کو جلد دفنانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس لئے میت کو قبرستان لے جایا گیا اور جنازے کے بعد بھی خاصی دیر پرویز کا انتظار کر کے دفنا دی گئی۔

قبرستان پہنچنے کے لئے میں نے اس خیال سے اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے لیا کہ شاید ایک خاتون کی وجہ سے سکیورٹی والے کچھ رعایت برتیں مگر لگتا تھا کہ آج شہر میں کسی مرد کے ساتھ تو شاید رعایت برتی

جائے ، خواتین کو دیکھ کر پولیس اور زیادہ چوکس ہو جاتی تھی ۔ہمیں شاہراہِ کشمیر تک پہنچنے کے لئے ہر راستہ مسدود ملا ۔ اوپر ہیلی کاپٹرز اڑ رہے تھے اور نیچے گاڑیوں کی سخت چیکنگ ہو رہی تھی ۔ ہم نے آبپارہ مارکیٹ کے اندر اور باہر کے سارے راستے بند پائے ۔لیکن مختلف چوکوں کا چکر لگانے کے بعد اور مایوس ہو کر ہم ایک کچے چور راستے سے خیابان سہروردی اور پھر شاہراہِ کشمیر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ۔واپسی پر بھی بے حد دقت ہوئی ۔ہم سیاسی لیڈر تو تھے نہیں کہ خار دار تاروں کو پھلانگنے اور ڈنڈے کھانے کا کوئی تجربہ ہوتا پولیس والوں کی منت سماجت کرتے رہے کہ ہمیں گھر جانے دیا جائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتے ۔آخر وہی کچا چور راستہ پھر اختیار کیا اور ہم آبپارہ کے عقب کی گلیوں سے ہو کر گھومتے گھماتے کسی نہ کسی طرح اپنے گھر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ۔گھر آ کر ٹیلی فون کر کے پتہ کیا ۔ پرویز گذشتہ رات لاہور سے روانہ ہوا تھا مگر چوبیس گھنٹے بعد بھی اسلام آباد نہیں پہنچ سکا تھا۔

پرویز اگلے روز قبر پر پہنچا اور دعا کرنے کے بعد ہچکیاں لیتے ہوئے اس نے قسم کھائی کہ وہ اس ملک میں جہاں اسے اپنی ماں کا آخری دیدار کرنے کا بھی موقع نہیں دیا گیا ، اب کبھی واپس نہ آئے گا۔وہ اپنے عزیز رشتہ داروں سے ملا ضرور مگر رات کو میرے ہاں ہی ٹھہرا ۔ رات کو وہ حافظ کا دہڑا پڑھ پڑھ کر خود بھی روتا اور ہمیں بھی رلاتا رہا۔

وقت جنازے آیئنیں، لنگھ آویں وقت دفن دے
دل ڈیکھ گھنی تیڈی آمد تے کھل ویسن بند کفن دے
ڈُکھ ٹلسِن عالم برزخ دے لنگھ ویسن وقت امن دے
جُل آکھسوں حافظؔ روحاں کوں ہن لکھ احسان سجن دے

(جنازے کے وقت تم نہیں پہنچ سکے تو دفنانے کے وقت ہی آجانا اور دیکھنا کہ تمہاری دیدی کی خاطر کفن کے بند کھل جائیں گے اور عالمِ برزخ کے دکھ ٹل جائیں گے اور میں عالمِ ارواح میں جا کر بتاؤں گی کہ یہ سب میرے محبوب کے احسان کے سبب ہے)

میں نے اسے بہت سمجھایا ، اس واقعہ کو ایک حادثے کی طرح بھول جانے اور اچھے وقت کا انتظار کرنے کا مشورہ دیا ۔لیکن وہ رشتے داروں کے بعد اب ملکی اور قومی معاملات سے بھی بدظن ہو چکا تھا۔وہ کہتا کہ پتہ نہیں تم لوگ ان حالات میں کیسے زندہ ہو ۔ میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے ۔ہم چار روز اس موضوع پر بحث کرتے رہے ۔ میں اسے وطن کی مٹی اور بزرگوں کی قبروں کے حوالے دیتا اور ملک میں آمریت کی اندھیری رات کے بعد جمہوریت کی متوقع روشنی کی امید دلاتا اور اس کی ملک اور بہن بھائیوں سے مایوسی کم کرنے کی کوشش کرتا وہ بدستور اپنے عہد پر قائم رہا۔تاہم میرے ساتھ اس کی دوستی ، محبت اور تعلق میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ مجھے سیر و سیاحت کی خاطر اپنے پاس آنے کی دعوت دیتا رہتا تھا اس لئے ایک بار جب مجھے لندن جانے کا موقع ملا تو میں چند روز اس کے پاس بھی گزار آیا اور اس کی میزبانی کا خوب لطف اٹھایا۔

میں اس کی پُر آسائش اور خوشحال زندگی اور حکومت کی طرف سے کئے گئے فلاحی اقدامات ، تحفظ اور انصاف پر مبنی نظام کی برکتیں دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ وہ جن سچی جمہوری اقدار اور معاشرتی مساوات کا ذکر اپنے خطوط میں کیا کرتا تھا ، انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میرا ایک بے حد فرسودہ اور پچھڑے ہوئے معاشرے سے تعلق ہو لیکن اس کے باوجود میں نے وہاں ہر تارکِ وطن کے دل میں وطن کی محبت کی ایک شمع سی جلتی محسوس کی ۔خود پرویز بھی اس حوالے سے کبھی کبھی ڈپریشن اور اُداسی کا شکار ہو جاتا تھا ۔بس اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے اسے اپنی قسم توڑنے اور پاکستان آنے جانے بلکہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں سمیت پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے پر رضامند کر لیا۔اور اب وہ اسی سلسلے میں ایک قسم کا سروے کرنے پاکستان آ رہا تھا کہ ایک طویل عرصہ کی آمریت کے بعد بحال ہونے والی جمہوری فضا سرمایہ کاری کے لئے کہاں تک موزوں ہے ۔ وہ بیس برس کے وقفے کے بعد تیسری بار اپنے وطن لوٹ رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ اللہ کرے پرویز کے پاکستان قیام کے دوران قومی یا معاشرتی سطح پر کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہو جس سے وہ پھر سے بددل ہو جائے ۔

خدا خدا کر کے جہاز کے لینڈ کرنے کا اعلان روشن ہوا۔ ہجوم میں حرکت پیدا ہوئی اور چھائی ہوئی مردنی کروٹیں لے کر بیداری میں تبدیل ہونے لگی۔ ایک دوسرے میں خلط ملط ہوتی انسانی آوازوں کا ناقابل فہم شور تیز ہو گیا۔ ہوٹلوں موٹلوں کے نمائندے، ٹیکسیوں کے ڈرائیورز اور استقبال کو آئے ہوئے لوگ مسافروں کے باہر نکلنے کے راستوں کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے بلکہ بعض راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے۔ سکیورٹی والے انہیں پیچھے ہٹاتے مگر وہ پھر آگے آ جاتے۔ میں اس دھکم پیل سے بچنے کے لئے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر کے مزید انتظار کے بعد ٹرالیوں کے ساتھ ساتھ مسافروں کے باہر آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اچانک سفید بالوں اور لمبی سفید ریش والے ایک بڑے میاں زبردستی مجھ سے چمٹ گئے۔ میں نے چونک کر دیکھا اور کہا:

''بزرگوار یہ نہ کہہ دینا کہ تم پرویز ہو۔''

''بابا جی کبھی اپنی صورت آئینے میں نہیں دیکھی؟'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھ سے زیادہ بوڑھے دکھائی دیتے ہو۔''

''بڑھاپے کو چھوڑو تم نے تو حلیہ بھی دہشت گردوں جیسا بنا لیا ہے۔''

ایسی ہی چھیڑ چھاڑ کرتے ہم پارکنگ ایریا میں آئے۔ وہ بار بار پلٹ کر دیکھتا جیسے کچھ پیچھے رہ گیا ہو۔

میں نے پوچھا ''کیا کوئی اور بھی تمہارے ساتھ ہے؟''

''نہیں تو'' اس نے کہا ''میں اکیلا ہی آیا ہوں۔''

ہم نے گاڑی میں سامان رکھا اور چل پڑے۔ وہ اب بھی کبھی کبھی پیچھے پلٹ کر دیکھ لیتا مگر پوچھنے پر ٹال جاتا۔

''یاد ہے۔ شروع میں جب تم وہاں گئے تھے، بلیو فلموں، نیوڈز اور لائیو سیکس شوز کی باتیں لکھا کرتے تھے۔''

''ہاں یہاں سے جو بھی جاتا ہے پہلے پہل ایسی چیزوں کی طرف لپکتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس کا جی بھر جاتا ہے۔ وہ انہیں کاہ برابر بھی اہمیت نہیں دیتا۔''

''پھر بھی تم میں بڑی تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔''

''وہاں دو ہی صورتیں ممکن ہیں'' اس نے وضاحت کی ''یا تو ان جیسے ہو جاؤ یا اپنی اصل کی طرف پلٹ جاؤ، جسے مغرب والے بنیاد پرستی کہتے ہیں۔''

''مگر تم تو سیکولر آدمی تھے۔ یہ تبدیلی کب اور کیسے آئی۔''

''جب وہاں ہمارے نبی ﷺ کے خاکے چھاپے گئے۔''

''تو گویا اہل مغرب اس قسم کی حرکتیں اسلامی انتہا پسندی کے فروغ کے لئے کرتے ہیں۔''

''یقیناً، یہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی ہے۔ وہ ہمارے ایمان کا درجہ حرارت معلوم کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد اشتعال دلانے والی ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں اور جواب میں کمہار کا غصہ گدھے پر کے مصداق ہمارے اہلِ وطن قومی املاک اور پبلک ٹرانسپورٹ کو آگ لگاتے اور توڑ پھوڑ کر کے غصہ نکالتے رہتے ہیں۔''

رات کے دس بجے کا وقت تھا ٹریفک زیادہ نہ تھی ہمیں ائیر پورٹ روڈ اور اسلام آباد ہائی وے کے ذریعے اسلام آباد جانا تھا مگر اس نے فرمائش کی کہ میں صدر کے علاقے سے ہوتا ہوا مری روڈ کے ذریعے جاؤں تا کہ وہ اپنی ان پرانی یادوں کو تازہ کرتا جائے۔ یہ سیر کرنے کا وقت نہیں تھا مگر مجھے خوشی ہوئی کہ اسے سب یاد تھا جب ہم دونوں چھٹی کے روز آگے پیچھے سکوٹروں پر سوار راولپنڈی صدر آتے جاتے تھے۔ اوڈین، سیروز یا پلازا سنیما میں کوئی فلم دیکھتے اور اولڈ بک شاپس کھنگالتے۔ اسلام آباد کی مارکیٹیں ان دنوں خاصی مہنگی اور تعداد میں کم تھیں، ہم ساری شاپنگ اور نظر بازیاں صدر کے بازاروں میں کرتے اور واپسی پر گھر کے لئے تازہ سبزیاں اور پھل بھی خرید لاتے۔ ہماری گھریلو اور دفتری پارٹیاں بھی صدر کے ہوٹلوں میں ہی ہوتی تھی۔ لیکن ان دنوں گاڑیوں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی مگر اب ہم جیسے جیسے صدر کے قریب ہوتے گئے گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا سڑکوں پر جگہ جگہ ناکے لگے تھے۔ وہ پریشان ہونے لگا تو میں نے منیر نیازی کے شعر میں تحریف کر کے اسے ہنسانے کی کوشش کی۔

ایک اور ناکے کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک ناکے کے پار اترا تو میں نے دیکھا

مگر پرویز کو ہنسی آئی نہ وہ خوش ہی ہوا۔ جیسے میری بات سن ہی نہ رہا ہو۔ وہ اب بھی ہر ناکے پر پلٹ کر پیچھے دیکھتا۔

''تم بار بار پیچھے کیا دیکھتے ہو؟'' بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

''کھویا ہوا ماضی'' اس نے ہنس کر بات ٹال دی۔

ان گنت ناکوں سے گزرتے ہوئے ہم صدر پہنچے مختلف بازاروں سے گزرتے ہوئے ہم وہاں گزاری ہوئی شاموں اور یادوں کو تازہ کرتے رہے کشمیر روڈ پر ریستورانوں اور تکے کبابوں کی دکانوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہر طرف اشتہا آمیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اگر گھر میں کھانے پر انتظار نہ ہو رہا ہوتا تو شاید ہم وہیں کہیں بیٹھ جاتے مگر طے پایا کہ کل پرسوں وہاں آ کر کڑاہی گوشت اور تکے کباب کھائیں گے۔ مری روڈ اب زیادہ کشادہ ہو گئی تھی۔ وہ بہت دلچسپی سے نئے تعمیر شدہ پلازوں اور عمارتوں کو دیکھ رہا تھا جیسے یہ سب اس کے لئے نیا اور انوکھا ہو اور میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اسے سب کچھ اچھا لگ رہا ہے اور اس کی اپنے وطن کے بارے میں رائے تبدیل ہو جائے گی۔ وہ ماضی کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کر کے خوش ہو رہا تھا۔ یہاں میرا فلاں دوست رہتا تھا۔ یہاں سکوٹر مرمت کرنے والے اُستاد شفیع کی دکان ہوا کرتی تھی۔ اس بیکری کے کیک مشہور تھے۔ یہاں مٹھائیوں کی دکان تھی جہاں کی برفی تمہاری بھابھی کو بہت پسند تھی۔

سکستھ روڈ کا ٹریفک سگنل بند تھا اور سیدھی جانے والی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا:

''اس کا مطلب ہے ابھی یہاں ٹریفک کے اصولوں کی پاسداری ہوتی ہے!''

''کیا مطلب؟''

''ملکی اور عالمی میڈیا پر پاکستان میں لاقانونیت اور نیچے سے اوپر کی سطح تک اصولوں کی خلاف ورزی کا جو نقشہ پیش کیا جاتا ہے اس کے پیش نظر میرے لئے یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ لوگ سرخ بتی دیکھ کر رک جاتے ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں ابھی قانون کی بالا دستی، عدل و انصاف کی اہمیت، انسانی مساوات اور سچی جمہوریت کا شعور پوری طرح اجاگر نہیں ہوا مگر ہم کوشش کر رہے ہیں، اتنی بھی مایوس کن صورتِ حال نہیں ہے۔''

ہم شمس آباد سے ذرا آگے آئے تو ٹریفک جام تھا۔ ابھی ہم صورتِ حال کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ ہمارے دائیں بائیں اور آگے پیچھے گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ گئیں۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ روٹ لگا ہوا ہے لیکن پرویز کو روٹ لگنے کی سمجھ ذرا دیر سے آئی۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ ہمارے صدر، وزیر اعظم یا کسی وی وی آئی پی نے گزرنا ہو تو ٹریفک کو روک دیا جاتا ہے اور اُن کے خیریت سے گزر جانے بلکہ منزل پر پہنچ جانے کے بعد کھولا جاتا ہے اور یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں، ہم اس کے عادی ہیں۔ مگر پرویز کے خیال میں یہ بات بہت تکلیف دہ تھی کہ حکمران اپنے عوام کے لئے باعثِ زحمت بنیں اور سینکڑوں گاڑیوں کا فیول ضائع ہوتا رہے۔ وہ جس ملک سے آ رہا تھا وہاں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب سینکڑوں چھوٹی بڑی گاڑیاں رکی کھڑی تھی۔ بعض لوگوں نے اپنی گاڑیوں کے انجن بند کر دیئے تھے لیکن جو لوگ افورڈ کر سکتے تھے ان کی گاڑیوں کے انجن اور ائیر کنڈیشنرز سٹارٹ تھے کیوں کہ گرمی بہت تھی۔ پھر گاڑیوں کے درمیان لمبے ہینڈلوں والے برش پکڑے بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں دکھائی دینے لگے۔ وہ اجازت لیے بغیر گاڑیوں کی ونڈ سکرینیں صاف کرتے آ رہے تھے۔ بعض لوگ انہیں کچھ دے دیتے بعض دھتکار دیتے۔ میں نے بھی ایک بچے کو ونڈو سکرین صاف کرنے سے منع کیا کہ وہ عام طور پر اسکریچ ڈال دیتے تھے لیکن پرویز نے اسے کام جاری رکھنے کا اشارہ کر دیا۔ پھر وہ اسے اور دوسرے بچوں کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ انہیں بہت سے پیسے دینا چاہتا تھا مگر میں نے منع کر دیا اور حسب معمول پانچ دس روپے دیتے ہوئے کہا:

''زیادہ پیسے دینا بھیک ہوگی اور انہیں عادت پڑ جائے گی۔''

اس نے میری بات مان لی۔ مگر وہ بڑی دیر تک چپ چاپ اور اداس رہا۔

جتنی دیر میں گوجر خان، مری یا واہ کینٹ پہنچا جا سکتا ہے یا ایک ہوائی جہاز اسلام آباد سے لاہور پہنچ جاتا ہے اتنی دیر ہم انجن سٹارٹ کئے گاڑی میں ٹریفک کھلنے کا انتظار کرتے رہے کہ گاڑیوں سے پیدا ہونے والی گرمی میں اے سی چلانا ضروری ہو گیا تھا۔ یوں بھی بعض گاڑیوں کے انجن بند کر دیئے جائیں تو دوبارہ مشکل سے سٹارٹ ہوتے ہیں۔ لوگ حکمرانوں کو کوس رہے تھے بعض گالیاں اور بددعائیں دے رہے تھے۔

خدا خدا کر کے ٹریفک میں حرکت پیدا ہوئی۔ پرویز سخت مضطرب ہو گیا تھا لیکن فیصل آباد کا نو تعمیر شدہ انٹرچینج دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ یہاں ایک بار تنگ موڑ پر گرے ہوئے ڈیزل سے اس کی سکوٹر پھسل گئی تھی اور اسے خاصی چوٹ آئی تھی۔ مگر ابھی وہ اپنی خوشی کا پوری طرح اظہار نہیں کر پایا تھا کہ فیض آباد کے پولیس ناکے پر ہمیں روک لیا گیا۔ میں نے یہ گاڑی حال ہی میں خریدی تھی اور میرا خیال تھا کہ لاہور کی نمبر پلیٹ کی وجہ سے ہمیں روکا گیا تھا۔ میں نے گاڑی کے کاغذات، لائسنس اور اپنا شناختی کارڈ دکھا کر جانے کی اجازت حاصل کی۔ لیکن انہوں نے گاڑی کی تلاشی کے بعد پرویز سے تفتیش شروع کر دی کیونکہ انہیں کسی ایسے ہی حلیے کے دہشت گرد کی خفیہ اطلاع ملی تھی۔

خاصی دیر کی بحث و تکرار کے بعد ہمیں جانے کی اجازت ملی۔ زیرو پوائنٹ انٹرچینج زیر تعمیر تھا گاڑیوں کو گرد و غبار کے بادلوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ جگہ جگہ سڑکوں پر مڑنے کے راستے کنکریٹ کی رکاوٹیں رکھ کر بند کر دیئے گئے تھے اور ہر موڑ پر دور سے گھوم کر آنا پڑتا تھا۔ پرویز کہنے لگا:

''لگتا ہے پاکستان میں تیل نکل آیا ہے اور پٹرول اور گیس کی خاصی فراوانی ہے''

''خدا کرے ایسا ہو لیکن فی الحال تو عوام ہی کا تیل نکالا جا رہا ہے'' میں نے جواب دیا۔

آبپارہ کو جانے والی دورویہ سڑک سکیورٹی مقاصد کی وجہ سے بند تھی۔ ہم خیابان سہروردی سے شاہراہ کشمیر پر آئے پھر سیونتھ ایونیو سے ہوتے ہوئے اپنے گھر پہنچے۔ وہاں گھر کے سامنے خاردار تاروں کی اونچی لمبی باڑ تھی، کنکریٹ کی رکاوٹوں نے گزرنے کا راستہ تنگ کر رکھا تھا اور سکیورٹی گارڈز الگ گھور رہے تھے۔

''تم یہاں رہتے ہو؟''

''ہاں تو''

''اس پنجرے میں؟''

''یہ سب ہماری بہتری اور حفاظت کے لئے ہے''

''تم نے خاردار تاروں اور لوہے کے جنگلوں سے گھری ہوئی جگہ پر کیوں گھر بنایا؟''

''میں نے گھر پہلے بنایا، لوہے کے جنگلوں اور خاردار تاروں نے اسے بعد میں گھیر لیا۔''

''تم نے یہاں سے فرار کے بارے میں نہیں سوچا؟''

''سوچا ہے لیکن یہاں مکانوں کی قیمتیں گر گئیں اور دوسرے علاقوں میں بہت زیادہ ہو گئی ہیں۔''

''اگر خدانخواستہ یہاں کوئی حملہ ہوا تو تم لوگ بھی ساتھ ہی۔''

''ہاں یہ تو ہے'' میں نے جواب دیا ''مگر میں سوچتا ہوں ناکوں پر ڈیوٹی دینے والے بھی تو ماؤں کے بیٹے ہیں جو ہر آنے جانے والے کی تلاشی لیتے ہیں۔ کئی چیک پوسٹوں پر ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ سکیورٹی اہلکاروں نے تلاشی لینا چاہی تو دہشت گردوں نے اپنے ساتھ انہیں بھی اڑا دیا۔''

''حکمران خود تو سکیورٹی کے فول پروف انتظامات کر کے اپنے محلوں میں چین کی نیند سوتے اور بلٹ پروف گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں، بھگتنا تو سکیورٹی پر مامور اہلکاروں کو پڑتا ہے۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں حکمرانوں کا یہی رویہ رہا ہے۔ وہ دشمن کے حملے کے وقت قلعہ بند ہو جاتے تھے اور گلیوں بازاروں میں رکھوالی پر مامور اہلکاروں اور رعایا کا قتلِ عام ہوتا رہتا تھا۔''

ہارن سن کر ملازم نے گیٹ کھولا۔ گاڑی اندر آئی مگر پرویز گاڑی

سے اتر کر گیٹ سے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو میں نے باہر جانے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگا:

''یوں ہی تمہارے اڑوس پڑوس کا جائزہ لے رہا تھا۔''

گھر والوں سے ملاقات، نماز اور کھانا، پھر گپ شپ، رات کا ایک بج گیا۔ میں نے کہا:

''چلو اب سو جاؤ تم تھکے ہوئے ہو گے۔''

کہنے لگا ''تمہارے پاس بارہ بور کی بندوق ہوا کرتی تھی، وہی جس سے ہم نے ایک بار اڑتے ہوئے تلیروں کا شکار کیا تھا؟''

''وہ تو اب بھی ہے لیکن میں نے شکار سے توبہ کر لی۔''

''پھر بندوق کا کیا مصرف؟''

''خود حفاظتی۔''

''کبھی چلا کر دیکھی؟''

''نہیں۔ البتہ بیٹا اسے کبھی کبھی صاف کر کے تیل دے دیتا ہے مگر کارتوس پڑے پڑے سیاہ ہو گئے ہیں پتہ نہیں ٹھیک بھی ہیں یا نہیں۔''

''پھر ایسے ہتھیار کا کیا فائدہ؟''

''دل کو تسلی رہتی ہے۔''

''فرض کرو ضرورت پڑ جائے اور تم ہوائی فائر بھی نہ کر سکو تو؟''

''یار سچی بات یہ ہے کہ میں اسے چلانا چاہتا ہی نہیں۔ کیوں کہ میں کسی کو ہلاک یا زخمی نہیں کر سکتا۔''

''لیکن اگر کوئی چور یا ڈاکو اندر گھس آئے تو؟''

''میں اسے ہلاک کرنے کی بجائے خود اس کی گولی کا نشانہ بننے کو ترجیح دوں گا۔''

''اوئے وقتِ پیری پرہیز گار بننے والے گرگِ ظالم'' اس نے قہقہہ لگایا ''تم مہاتما بدھ کے چیلے کب سے بن گئے؟''

''جب سے چیزوں کی سمجھ آئی اور زندگی کی قدر و قیمت معلوم ہوئی ہے۔''

''پھر تم بھی سن لو ایک نامعلوم اور مشکوک شخص اپنی سوک ہنڈا میں ائیر پورٹ سے ہمارا پیچھا کرتا یہاں تک چلا آیا ہے۔ اس نے ائیر پورٹ پر مجھے پوچھا تھا کہ گاڑی چاہیے مگر میں نے منع کر دیا۔ میں نے اسی کی وجہ سے تمہیں صدر اور مری روڈ کے گنجان آباد راستے سے گزرنے کی فرمائش کی تھی۔ ہم کئی بار اس کی نظروں سے اوجھل ہوئے مگر وہ اگلے ناکے پر پھر ہمیں آ لیتا۔ وہ تمہارا گھر بھی دیکھ گیا ہے اور اب وہ اپنے ساتھیوں سمیت کسی بھی وقت ڈاکہ ڈال سکتا ہے۔ تم کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔''

پرویز کی باتیں سن کر ایک بار تو میرے پاؤں کے نیچے سے بھی زمین نکل گئی مگر میں جلد ہی سنبھل گیا اور اپنے اوسان بحال کرتے ہوئے کہا:

''یہ تمہارا وہم ہے۔ تم اپنے ملک کے حالات سے بہت زیادہ بدگمان ہو۔ چند روز یہاں رہو گے تو تمہارا اعتماد بحال ہو جائے گا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اچھا اب تم جا کر سو جاؤ۔ بھابی انتظار میں جاگ رہی ہوں گی۔''

''اور تم بھی'' میں نے اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا ''شب بخیر''

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اخبار میں چھپ چکا ہے اور اس میں کچھ نیا نہیں تھا۔ ایسی وارداتیں اور واقعات اب روزمرہ کا معمول بنتے جا رہے ہیں۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ان کے پاس جدید اسلحہ تھا۔ انہوں نے ملازم کو رسیوں سے باندھ دیا، میرے بیوی بچوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور ہم دونوں پر کلاشنکوفیں تان کر کھڑے ہو گئے۔ پرویز نے اپنے دونوں اٹیچی کیس اور بریف کیس جن میں کپڑے، تحائف اور ڈالروں کی صورت میں خاصی رقم تھی ان کے حوالے کر دیئے لیکن وہ ہمارے گھر کی ساری جمع پونجی اور بیوی اور بہو کے زیورات بھی لے گئے۔ ہاں انہوں نے ہماری ایک بات ضرور مان لی کہ جاتے ہوئے بریف کیس سے پرویز کا پاسپورٹ اور دیگر ڈاکومنٹس نکال کر پھینک گئے۔

ہاں ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ مجھے ڈر تھا کہ پرویز بددل ہو کر فوراً ہی واپس چلا جائے گا مگر اس پر الٹا اثر ہوا۔ کہنے لگا:

''اس ملک کے لوگوں کو ابھی تعاون کی بہت ضرورت ہے۔ ہم اس میں اپنا حصہ ضرور ڈالیں گے۔''

میری عظیم والدہ.....کچھ یادیں کچھ باتیں

حضور پاک ﷺ نے فرمایا:تم میں سے کسی کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں تمہیں اپنے ماں باپ سے بڑھ کر عزیز نہ ہو جاؤں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قدرتی طور پر انسان کو سب سے زیادہ محبت اپنے ماں اور باپ سے ہوتی ہے۔ ماں باپ دنیا کی اتنی عظیم نعمت ہیں جن کی کمی کو کوئی پورا نہیں کرسکتا۔

ماں باپ کے لئے بھی سب سے قیمتی متاع ان کی اولاد ہوتی ہے ہر باشعور ماں اور باپ سب سے زیادہ فکرمند اپنی اولاد کی تربیت کے لئے ہوتے ہیں۔قارئین بتول کے لئے بھی میں اپنی عظیم والدہ بنت مجتبیٰ مینا کی ان کاوشوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جو انہوں نے میری تربیت کے حوالے سے ملحوظ رکھیں اور مجھے معاشرہ کا مفید فرد بننے میں مدد کی۔

اسلاف کے بارے میں آگاہی:

امی نے میری تربیت میں جس چیز کو سرفہرست رکھا وہ تھی مجھے بحیثیت مسلمان بچے کے اپنے شاندار اور تابناک ماضی سے روشناس کرانا۔صلیبی جنگیں اور ان میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے شجاعت و بہادری کے واقعات سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر گزرنے والے مختلف مشکل ادوار کا ذکر بھی وہ باتوں باتوں میں کرتی رہتیں۔اسی وجہ سے اپنی عمر کے باقی بچوں کے مقابلے میں میں سقوط بغداد،سقوط غرناطہ،سقوط سلطنت ہند اور ان کے اسباب پر میری معلومات دوسروں کو قابل رشک محسوس ہوتیں۔

اسی حوالے سے وہ مجھے ایسے اشعار بھی یاد کرواتیں جن میں عزم و ہمت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دگرگوں حالت بھی موثر انداز میں پیش کی جاتی تھی مسدّس حالی سے جو اشعار انہوں نے مجھے بچپن میں یاد کروائے تھے وہ آج بھی مجھے یاد ہیں۔

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے
بھنور میں جہاز جس کا آکر گھرا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہلِ کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہلِ کشتی

اسی طرح ایک قطعہ انہوں نے مجھے یاد کروایا وہ کچھ یوں تھا۔

گھڑ دوڑ میں کدائی کی بازی تھی ایک دن
ترکی پہ اپنے ، تازی پہ کوئی سوار تھا
جو ہچکچا کے رہ گیا وہ رہ گیا ادھر
جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

میری والدہ نے میری فکری تربیت اس طرح کی کہ نہ تو میں اردگرد پھیلی ہوئی خرابیوں کو دیکھ کر مایوس ہوں اور نہ دل برداشتہ۔اپنی شاندار روایات کا علم رکھنے کی وجہ سے غیر ملکی اقوام کے افراد سے ملتے ہوئے نہ بلا ضرورت متاثر ہوں نہ احساس کمتری میں مبتلا اور اپنی تاریخی غلطیوں کے ادراک کی وجہ سے تکبر اور احساس برتری سے بھی بچا رہوں۔

حالات حاضرہ سے دلچسپی

چھوٹے بچوں سے ظاہر ہے ملکی و بین الاقوامی معاملات پر

فرزانہ چیمہ

چلتے چلتے

بات چیت نہیں ہوسکتی مگر میری والدہ کھانے کی میز پر اور فرصت کے لمحات میں ابا جی سے حالات حاضرہ پر گفتگو اور تبصرہ کرتی رہتیں جس کے نتیجے میں بالواسطہ طور پر بچوں کے ذہن میں بھی اپنی بساط کے مطابق شعور اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ۔ مجھے یاد ہے کہ عرب اسرائیل جنگ کے حوالے سے گھر میں فکر وغم دیکھ دیکھ کر میں نے امی سے ایک دن بے ساختہ کہا کہ ''کوئی اسرائیل کا مقابلہ کیوں نہیں کرتا؟''

بچپن سے ان باتوں کو سننے کے نتیجے میں اور مسلمان امت کے لئے امی کی حساسیت کو دیکھنے سے میرے اندر ''انما المومنون اخوۃ'' کا تصور صحیح طور پر جاگزین ہوا اور اپنے پیشہ وارانہ کیریئر کے دوران دنیا کے جس کونے میں بھی گیا قومیت، رنگ ونسل سے قطع نظر جس شخص کو مسلمان پایا تو اس کو اپنا بھائی سمجھا اور اس سے ویسا ہی سلوک کرنے کی کوشش کی جیسا کہ اپنے بھائی سے کرنا چاہیے ۔ جبکہ اگر کسی دشمن سے سامنا ہوا تو سلطان صلاح الدین ایوبی کے اپنے دشمن رچرڈ شیر دل کو تحفے دینے والے واقعات نے شدید نفرت کے اظہار سے روکے رکھا۔

بچوں کی موجودگی میں ماں باپ کی مثبت گفتگو نہایت دوررس اثرات رکھتی ہے۔

صلہ رحمی

معاشرہ کا مجموعی ڈھانچہ اس میں رہنے والے افراد اور ان کے خاندانوں پر مشتمل ہوتا ہے اگر کوئی فرد اپنے رشتوں سے کٹنا شروع کر دے تو نتیجتاً معاشرہ میں ٹوٹ پھوٹ اور افراتفری دکھائی دینے لگتی ہے ۔ میری والدہ نے ہمیشہ رشتوں کو مضبوط رکھنے کی طرف توجہ دلائی ۔ وہ کہا کرتیں کہ رشتہ داریاں تین قسموں کی ہوتی ہیں ۔ (۱) والد کے رشتہ دار (۲) والدہ کے رشتہ دار (۳) سسرال کے رشتہ دار۔

ان تینوں قسم کے رشتہ داروں سے خیر خواہانہ تعلقات قائم رکھنے پر انہوں نے شدید اصرار کیا۔ چاہے ان تعلقات کو قائم رکھنے میں کتنی ہی زحمت و تکلیف کیوں نہ اٹھانا پڑے ۔ سب سے بڑی مثال اس معاملے میں وہ خود تھیں ۔ اگر انہیں کسی کی طرف سے تکلیف بھی پہنچتی تو اسکا برسر عام ذکر نہ کرتیں ۔ میرے معاملے میں ان کی پوری کوشش ہوتی کہ میرے کان میں کسی رشتہ دار کی برائی اڑتی ہوئی بھی نہ پہنچے ۔ یہ احتیاط بچپن کے مقابلے میں نوجوان بچوں میں زیادہ اہم ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ جوان اولاد تو ماں باپ کے حق میں دوسروں سے لڑنے کے لئے کمر کسنا شروع کر دیتی ہے۔

امی اگر کبھی رشتہ داروں کے متعلق گفتگو کرتیں بھی تو اس کے مثبت طرز عمل اور اچھے اخلاق کے حوالے سے ہوتی ۔ وہ خاص طور پر کسی بھی رشتہ دار کے حسن سلوک کا چاہے وہ عمر میں کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا بار بار ذکر کرتیں تاکہ بچوں کے دل میں متعلقہ فرد کے لئے ہمدردی اور عزت پیدا ہو۔ ان کی اسی مخلصانہ جہدِ مسلسل نے ہمیں اپنے خاندان سے جوڑا اور اتنے بڑے خاندان میں کسی فرد نے بھی ان کے حوالے سے کسی شکایت، شکوہ اور رنجش کا ذکر نہیں کیا۔

میری والدہ نے اس حدیث پاک کہ ''لوگوں سے محبت بھرا برتاؤ آدھی عقل ہے'' کو اپنا زندگی بھر کا وطیرہ بنایا اور ہمارے لئے بھی اسی کو راہنما اصول قرار دیا۔

میری والدہ بلا شبہ ایک غیر معمولی خاتون تھیں میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا نہایت شکر گزار بھی ہوں اور بجا طور پر فخر بھی کرتا ہوں کہ

اس نے مجھے امی جیسی ماں عطا کی جو رویہ اور انداز ہم اپنی پوری پچیس، تیس سال کی پیشہ وارانہ زندگی کے تجربات اور تعلیم سے حاصل کرتے ہیں وہ امی میں خداداد طور پر موجود تھے۔ میں نے ایک مرتبہ اپنی بہن سے اسکا بے ساختہ اظہار بھی کیا کہ امی کا تو Admiral like attitude یعنی ایڈمرل جیسا انداز اور رویہ ہے۔

اپنی خوشی، غمی، ناراضگی کا اندازہ نہیں ہونے دیتی تھیں۔ امی کی شخصیت میں اُتھلا پن بالکل نہیں تھا۔ (اور خواتین میں اس چیز کا نہ ہونا بڑی خاص بات ہے معذرت کے ساتھ!)

امی کی زندگی کے آخری دور کے حوالے سے تین چیزیں میرے لئے نا قابل فراموش رہیں گی۔ بلکہ اگر یہ کہوں کہ میری زندگی کا قیمتی ترین سرمایہ ہیں تو غلط نہ ہوگا۔

پہلی چیز میرا امی کے ساتھ سفر حج ہے۔ میں ذروہ اور امی 2002ء میں حج پر گئے تھے۔ حج سے پہلے امی کی اور میری علمی و روحانی تیاری، حج کے دوران امی کی کیفیات اور جذب کا عالم اور وہیل چیئر پر حج کے دوران خواتین کا امی کے والہانہ ہاتھ چومنا اور عقیدت کا اظہار کرنا مجھے زندگی کے آخری سانس تک یاد رہے گا۔

دوسری چیز امی کے ساتھ دورۂ تفسیر قرآن ہے۔ عصر کے آخری حصے میں تین سال کی مدت میں، میں نے امی کے ساتھ مل کر پوری تفسیر ابن کثیر پڑھی۔ امی سارا دن میرے دفتر سے واپسی کی منتظر ہوتیں۔ مجھ سے محبت سے کہا کرتیں ''سارا دن تیرا، انتظار کرتی ہوں، تجھے دیکھ کر جان پڑ جاتی ہے۔'' میں نے اپنا معمول بنایا ہوا تھا کہ والدہ کے ساتھ بیٹھ کر قرآن پاک کی تفسیر پڑھوں۔ اس سے وہ بہت خوش ہوتیں۔ اکثر میرا تلفظ درست کرواتیں اور قرآن پاک کو نہایت تکریم سے پکڑنے پر زور دیتیں۔

تیسری چیز گو پہلی دونوں چیزوں کے مقابلے میں کہیں کم تر درجے کی ہے مگر مجھے جو مزہ اور خوشی اس کے نتیجے میں حاصل ہوئی وہ مجھے مجبور کرتی ہے کہ اسکا تذکرہ بھی کیا جائے۔

2009ء کی گرمیوں کی چھٹیوں میں عینی اور زہرا اپنے اپنے بچوں کے ساتھ میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔ امی کی خوشی ایسے موقعوں پر دیدنی ہوتی۔ روز کہیں نہ کہیں سیر تفریح کا پروگرام بنتا اور امی بھی اس میں شامل ہوتیں (وہیل چیئر کے ساتھ) ایک دن ہم نمک کی کان، دیکھنے کھیوڑہ پہنچ گئے۔ جب کان کے سرے پر پہنچے تو پتا چلا کہ کان کے اندر جانے والی ٹرین بند ہے۔ دونوں بہنیں بچوں سمیت پیدل ہی کان میں چلی گئیں۔ میں امی کے ساتھ باہر ٹھہر گیا۔ میرا دل مسلسل اس فکر میں غلطاں و پیچاں تھا کہ امی کو اندر کیسے لیکر جاؤں۔ ایک دفعہ جا کر جائزہ بھی لیا مگر کان کے اندر وہیل چیئر چلانے کے حالات نہ تھے ایک گھنٹہ اسی کشمکش میں گزر گیا۔ اچانک خبر ملی کہ ٹرین روانہ ہو رہی ہے۔ بس میں نے اپنا اور امی کا ٹکٹ خریدا، وہیل چیئر انجن پر فولڈ کر کے رکھوائی اور اندر پہنچ گئے۔ ادھر دونوں بہنیں ایک گھنٹے کی محنت سے اندر پہنچی تھیں اور مین ہال کی سیڑھیوں پر تھکی ہاری بیٹھی تھیں۔ انہوں نے جو مجھے اور امی کو آتے دیکھا تو ایک لمحہ کو تو انہیں یقین ہی نہیں آیا .....آج بھی جب ان دونوں کی بے یقینی اور حیرانی کا حال سوچتا ہوں تو ہنسی آجاتی ہے۔

غرض امی نے مزے سے کان میں بنی مسجد بھی دیکھی اور مینار پاکستان بھی، پل صراط بھی دیکھا اور دیوار محبت بھی امی کو سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا اور وہ بھرپور لطف بھی اٹھاتیں۔

یہ امی کی بھی خوش نصیبی تھی اور ہماری بھی کہ امی کی زندگی کا آخری دور بہت پرسکون اور پر لطف تھا۔ اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ اپنے ابدی گھر میں بھی انکا قیام پُرسکون و پُرلطف ہو۔ آمین

میرے والد

ان کے ساتھ گزارا ہر لمحہ ہمیشہ کے لئے میرے دل پر نقش ہو چکا ہے۔ایک بہو کا خراجِ عقیدت

میرے والدِ محترم پروفیسر امین جاوید مرحوم میرے لئے کیا مقام رکھتے تھے، یہ حقیقت الفاظ میں کبھیبیاں نہیں ہوسکتی۔ پھر بھی اُن کی چند یادیں قلم سے محفوظ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، اگر چہ دل میں تو اُنکے ساتھ بتایا ہر لمحہ پوری گہرائی کے ساتھ ہمیشہ کیلئے نقش ہو چکا ہے۔

میں اُن کی چار بہوؤں میں سے سب سے چھوٹی بہو ہوں، اور بارہ سال پہلے، جب میری شادی ہوئی، اُس وقت میں ایک عام، آزاد خیال، جدیدیت زدہ، دین سے بے بہرہ نوجوان لڑکی تھی۔بس شادی سے قبل کئے گئے عمرہ وحج کے طفیل سر پر سکارف اوڑھنا شروع کر رکھا تھا، خواہ قمیض کے بازو آدھے ہی کیوں نہ ہوں اس سے زیادہ تعلق دین کے ساتھ میرا قائم نہ تھا۔ یوں بھی میں نے پنجاب یونیورسٹی سے فلسفے میں ماسٹرز کر رکھا تھا، بس یہی فلسفہ دوسروں پر جھاڑتی رہتی تھی۔

ابو کا تعلق بھی میرے ساتھ منفرد نوعیت کا تھا۔ پیار محبت بھی خوب تھا اور تنقید بھی کھل کر کیا کرتے تھے۔ابو تو تھے ہی اپنی دُھن کے پکے، مگر میں بھی آسانی سے کسی بات پر قائل ہونے والی نہ تھی۔ اکثر سوالات کی شکل میں ابو میرے ساتھ بحث کا آغاز کیا کرتے تھے۔ اُس وقت تو وہ سوال بعض اوقات مجھے حیران کر دیتے تھے اور میں سوچتی تھی کہ ابو کا یہ پوچھنے سے کیا مقصد ہے، مگر اب اُن سوالات کی حکمتیں سمجھ آتی ہیں کہ اُنکے ذریعے سے ابو مجھے کیا کچھ سکھا کر گئے۔

میری شادی کے ابتدائی دنوں ہی میں ابو نے ایک دن مجھ سے دین پر مباحثہ شروع کر دیا اور اچانک مجھ سے سوال پوچھا کہ ''قرآنِ کریم کا موضوع کیا ہے؟'' مجھے تو یہ سوال اُس وقت کچھ بچگانہ محسوس ہوا۔اس کا سیدھا سادہ جواب تو میرے ذہن میں آیا کہ ''قرآن کا موضوع انسان ہے'' لیکن یہ مجھے کچھ زیادہ ہی سادہ محسوس ہوا اور میں ابو کو لمبے چوڑے فلسفیانہ جواب دے کر Impress کرنے کی کوشش کرنے لگی۔بس جی، پھر جو کچھ ابو نے مجھے سمجھایا، اُس سے تو میں شرم سے پانی پانی ہو کر رہ گئی اور یہ احساس وشعور دل میں بیدار ہوا کہ محض بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر لینے سے ہی علم حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ جو اصل علم ہے، یعنی ایسا علم جس سے رب کی معرفت نصیب ہو، یعنی قرآن وسنت کا علم، اس حقیقی علم سے میں نے اپنے آپکو بالکل خالی ہی پایا۔

اُس وقت سے ایک جستجو سی پیدا ہوئی کہ جس علم کے ذریعے سے آخرت کی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے، اس کو حاصل کرنے کی بھی کوئی جدوجہد کی جانی چاہیے۔

ابو کی خواہش تھی کہ میں باقاعدہ حجاب اختیار کروں لیکن میں نے اُنہیں صاف بتا دیا کہ اگر تو آپ چاہتے ہیں کہ میں بس آپ کا حکم مانتے اس کی تعمیل کروں، تو میں ایسا کر سکتی ہوں۔لیکن جہاں آپ ساتھ نہیں ہوں گے، اور پھر میں پردہ نہ کروں گی تو یہ تو منافقت ہوگی اور اگر آپ چاہیں کہ میں اس کو اللہ کا حکم جانتے ہوئے اس کی رضا کی خاطر اختیار کروں تو پھر مجھے کچھ مہلت دے دیں، میں سوچ سمجھ کر شرحِ صدر کے ساتھ اسکے بارے میں مطالعہ کروں گی اور جس بات پر میرا دل مطمئن ہوا، اس کو اختیار کروں گی تا کہ اس کو قائم بھی رکھ سکوں۔اُس وقت ابو کو میرا انکار اچھا تو نہ لگا، (جو لوگ ابو سے واقفیت رکھتے ہوں گے، وہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ ابو کو کسی بات پر انکار کرنے کی مجال شاید ہی کسی کی ہوتی ہوگی) مگر بہر حال انہوں نے

اپنے حکم پر اصرار نہ کیا۔ البتہ اگلے ہی دن میرے لئے مولانا مودودیؒ کی کتابوں کا تحفہ بھیج دیا جن میں ''پردہ'' خطبات'' اور اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات وغیرہ شامل تھیں۔

ایک طویل عرصے تک یہ کتابیں میری الماری کی زینت تو بنی رہیں لیکن ان کو کھول کر پڑھنے کا کوئی موقع ہی نہ مل سکا۔ جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بچپن ہی سے مجھے انگریزی ادب پڑھنے کا شوق تھا، اس لئے اردو تحریر میں میری کوئی خاص دلچسپی نہ تھی بلکہ مجھے دقت محسوس ہوتی تھی۔ جب بھی ابو پوچھتے کہ کیا کوئی کتاب پڑھی تو نفی میں جواب دیتے ہوئے مجھے شرم سی محسوس ہوتی اور اس شرمندگی سے بچنے کی خاطر بالآخر میں نے ''پردہ'' کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس وقت بہت زیادہ سمجھ کر تو میں نے نہ پڑھا لیکن بہر حال ابو کو خوش کرنے کیلئے مطالعہ جاری رکھا۔ ابو اکثر تفہیم القرآن میں سے بھی منتخب آیات اور ان کی تفسیر فوٹو کاپی کروا کر مجھے بھجواتے اور میں بغور انکا مطالعہ کرتی کیونکہ پتہ ہوتا تھا کہ اگلی ملاقات میں ابو نے سب سے پہلے اسی کے متعلق سوال کرنا ہوگا۔ یہ سالہا سال اُن کا مستقل طریقہ کار رہا۔

بہر حال دل میں جو شوق بیدار ہوا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و مہربانی سے مجھے قرآن پاک کی متعدد محفلوں میں کھینچ کر لے جایا کرتا تھا۔ کینٹ میں جماعتِ اسلامی کے حلقۂ درس میں کئی سال شرکت رہی۔ اپنی ذات کی حد تک تو میں نے گویا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ اللہ پاک واقعی بڑا رحیم و کریم ہے۔ وہ تو جیسے اس انتظار ہی میں ہے کہ میرا کوئی خطا کار بندہ میری طرف واپس لوٹنے والا بنے تو سہی پھر اگر ہم ایک بالشت آگے بڑھیں تو وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے، اگر ہم ایک قدم بڑھیں تو وہ دس قدم بڑھتا ہے، اگر چل کر جائیں تو رب کریم دوڑ کر آتا ہے اور بندے کے لئے ہدایت کے راستوں پر چلنا آسان بنا دیتا ہے۔ پھر جب اللہ نے توفیق دی اور میں نے باقاعدہ طور پر اقامت دین کا راستہ چن لیا تو اس پر سب سے زیادہ خوشی و محبت کا اظہار ابو ہی نے مجھ سے کیا اور ہر قدم پر اچھے مشورے دیئے اور حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔ ابو کو اللہ کے دین اور تحریک سے والہانہ محبت تھی اور اس محبت میں اُنکی زندگی کے آخری لمحات تک مسلسل اضافہ ہوا۔ میں اپنے آپ کو انتہائی خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ میں نے اُن کی سب سے قیمتی میراث یعنی اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے کام کرنے کا حقیقی جذبہ اُن سے پانے کی کوشش کی جو کہ شاید حقیقی ورثاء کو بھی نصیب نہیں ہو پاتی۔

دس سال قبل 2001ء کے جنوری میں ابو کو برین ہیمرج ہوا جس کے باعث اُن کی بائیں طرف کا جسم کچھ مفلوج اور کمزور ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے پہلے کے سے جذبوں کے ساتھ ہی اللہ کے دین کا کام بھی کیا اور دوبارہ شعبۂ تعلیم میں بھی اپنی گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔

اس کے بعد اپنی وفات تک وہ یکے بعد دیگرے متعدد نازکبیماریوں کا شکار ہوئے۔ کئی انتہائی نازک آپریشن کروائے لیکن ہر مرتبہ اُن کے ڈاکٹر حیران پریشان ہو کر رہ جاتے کہ یہ کس قسم کا مریض ہے جو نہ ہی اپنی بیماریوں کے خوفناک اور دل دہلا دینے والے نام سن کر پریشان ہوتا ہے اور نہ ہی موت کو سامنے دیکھ کر گھبراتا ہے۔ یقین کیجئے آپریشن تھیٹر جاتے ہوئے بھی ابو، نعیم صدیقی صاحب کی یہ نظم ''دیئے بہر سو جلا چلے ہم تم ان کو آگے جلائے رکھنا'' سنا سنا کر ہمیں رلاتے ہوئے جاتے تھے۔ واپس آتے تو بے ہوشی میں بھی زبان پر اللہ کا نام ہوتا تھا اور ہوش میں آتے ہی سب سے بڑھ کر نماز کی فکر ہوتی اور ایک نماز کو کئیکئی مرتبہ دہراتے رہتے۔ یہ منظر کئی مرتبہ ہماری نظروں سے گزرا۔

اللہ کی خاص توفیق سے اسے ہماری خوش قسمتی سمجھ لیں کہ پچھلے سال جولائی 2010ء کے آخر میں ہم لوگ ابو کے پاس ان کی رہائش گاہ میں شفٹ ہو گئے اور یوں اُن کی زندگی کے آخری سال اُن کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع خوش قسمتی سے میرے اور میرے بچوں کے حصے میں آیا۔

اگر میں آپ کو بتاؤں کہ اُن کے جسم میں کینسر کس حد تک پھیل

گیا تھا تو آپ کبھی یقین نہ کر پائیں کہ اس سب کے باوجود وہ روزانہ کالج اور سکولوں میں اپنے طے شدہ وقت پر جا کر کام کیا کرتے تھے۔ پچھلے سال شدید بیماری کے باوجود اُنہوں نے ایک بھی روزہ نہیں چھوڑا اور نہ ہی کوئی نماز قضا کی۔ رمضان میں ہم سب سے پہلے ہی وہ جاگ جایا کرتے (چونکہ عرصۂ دراز ہی سے تہجد گزار تھے) اور پھر ٹھیک اپنے بتائے ہوئے وقت پر سحری کے لئے بیل بجا دیتے تھے لیٹ ہونے یا تاخیر کرنے کے الفاظ تو سرے سے ان کی لُغت میں تھے ہی نہیں۔ میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی اکثر کاموں میں کچھ نہ کچھ لیٹ تو ہو ہی جاتی تھی (کیونکہ ابو تو منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب بھی خوب رکھتے تھے!) لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ میری کوتاہیوں پر جتنی زیادہ گنجائشیں وہ مجھے دیا کرتے تھے وہ کسی اور کے نصیب میں کم ہی آئی ہوں گی۔ میں نے اُن کے اس لاڈ پیار کا خوب فائدہ اٹھایا ہوا ہے (کبھی کبھی ناجائز فائدہ بھی، اللہ پاک کوتاہیوں سے درگزر فرمائے)۔

بہر حال ہر روز صبح غسل کے بعد ابو صاف ستھرے بغیر سلوٹ کے کپڑے پہن کر تیار ہو کر صوفے پر بیٹھ جاتے اور روزانہ شام کو مجھ سے یہ فقرہ کہتے کہ ''میں نے تو آج بھی پوری تیاری کی تھی کہ اللہ پاک مجھے روزے کی حالت میں اپنے پاس بلا لے لیکن اس نے بلایا ہی نہیں۔'' آخری وقت تک ہر جمعہ کے دن بھی وہ یہ فقرہ دہراتے تھے۔ اُن وقت تو میں اُنہیں کہہ دیتی کہ ابو آپ ایسی باتیں کیوں کہتے ہیں لیکن اب خیال آتا ہے کہ یہ کوئی معمولی فقرہ نہیں تھا۔ ہماری اپنی زبان سے کبھی کوئی ایسی بات کیوں نہیں نکلتی۔ اصل میں ایسی بات تو بس وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے اپنی تمام عمر رب سے ملاقات کرنے کی تیاری میں گزاری ہو۔ ہم نے تو چونکہ ایسی تیاری ہی نہیں کی تو پھر اس ملاقات کا شوق کیونکر پیدا ہو سکے بلکہ اس کا تو خوف ہی رہے گا نا!

اُن کی صحت تو دن بدن بگڑتی جا رہی تھی لیکن انہوں نے اس کے باوجود اپنے معمولات کو متاثر نہیں ہونے دیا دفتر اور اداروں کے کام بھی جاری رکھے اور اللہ کے دین کے کام بھی بڑھ چڑھ کر کرتے رہے۔

دسمبر 2011ء میں ان کی بیماری بہت زیادہ بڑھ گئی اور زیادہ وقت بستر پر ہی بسر ہونے لگا۔ مگر بیماری سے کہیں بڑھ کر محتاجی کا احساس ابو کے لئے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ گو کہ یہ حقیقت تو صرف اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ بیماری بھی کس قدر تکلیف دہ تھی اور ابو نے الحمد للہ اُس پر کس اعلیٰ درجے کا صبر کیا وہ بھی اسی کے علم میں ہے۔ اس دوران سارا دن بلکہ ابو رات بھر بھی اپنے چھوٹے صاحبزادے کو کسی نہ کسی کام کے لئے پکارتے رہتے اور بیٹے کی بھی خوش قسمتی کہ اللہ پاک نے جنت کمانے کا جو نادر موقع عطا کیا، اُس کے ہر لمحے میں باپ کی دعائیں اور اجر سمیٹنے کی توفیق میسر ہوئی۔

اس کے بعد کے دنوں میں کئی مرتبہ ایسے مواقع آتے جب کہ ابو پورے ہوش کی کیفیت میں نہ ہوتے تھے۔ لیکن بے ہوشی کی حالت میں بھی انہوں نے ایک نماز نہیں چھوڑی۔ یہ ہرگز مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقی مشاہدہ ہے جو کہ میں نے بذاتِ خود کیا۔ جونہی دوپہر کا ایک بجتا تو ابو خود بخود ظہر کی نماز کے لئے ہاتھ باندھ لیتے۔ اسی طرح باقی نمازوں کا معاملہ بھی تھا۔ خود بتاتے کہ میں فجر کے ساتھ ہی پورے دن کی نماز ادا کر لیتا ہوں کہ پتہ نہیں بعد میں ہوش کی حالت میں ہوں یا نہیں۔ (حالانکہ بے ہوشی کی حالت میں تو ان کی نماز ویسے بھی معاف تھی لیکن یہ اُن کی نماز سے محبت تھی کہ بار بار نمازیں ادا کرتے رہتے۔ میں پاس بیٹھے اُن پر رشک بھی کرتی رہتی اور دعا بھی کرتی کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور میری اولاد کو بھی نماز کی ایسی محبت نصیب فرمائے آمین) قرآن پاک کی تعلیمات کو پھیلانا ایامِ نوجوانی ہی سے ابو کا مقصدِ حیات بن گیا تھا۔ یہ شغف بھی آخری عمر تک بڑھتا ہی گیا۔ اُن کے پاس بیٹھ کر جب ہم تلاوت کرتے تو بہت خوش ہوتے۔ کئی دفعہ جو سورت ہم نے سنائی ہو، اس کے بعد ابو بھی کوئی نہ کوئی سورت ہمیں سناتے اور ہم سب اُن کے حافظے پر حیران رہ جاتے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ میرے کانوں میں تو چوبیس گھنٹے قرآن پاک کی تلاوت سنائی دیتی ہے۔

دسمبر 2010ء کے بعد بیماری کی شدت کے باعث جمعہ کی نماز کے لئے مسجد کم ہی جا سکے۔اس سے پہلے تو ابو پورے اہتمام سے تیار ہو کر مسجد چلے جاتے تھے اور گاڑی سے اترنے کی ہمت نہ ہوتی تو گاڑی میں ہی نماز ادا کر لیتے تھے۔فروری کے آخر میں اُنکے ایک فقرے نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔وہ کہنے لگے کہ ''میرے 7 جمعے ہو گئے ہیں۔میں نے تو مقدور بھر کوشش کی تھی مگر اللہ کو شاید یہی منظور ہو گا۔'' اس سے قبل ابو کی کیفیت اکثر نیم غنودگی کی ہوتی تھی یہاں تک کہ بعض اوقات تو گرد و پیش بھی پہچان نہیں پاتے تھے۔میں ان کی یہ بات سن کر دنگ رہ گئی کیونکہ مجھے تو خود بھی بالکل یاد نہیں تھا کہ وہ کتنے جمعے مسجد جا کر ادا نہیں کر پائے،مگر اُن کا دل چونکہ مسجد ہی میں اٹکا ہوا تھا سو اُنہیں بالکل صحیح یاد تھا۔

آخر میں انکا ایک اور حیرت انگیز واقعہ قلم بند کر رہی ہوں دسمبر سے فروری تک ابو کی حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔کھانا پینا بھی تقریباً چھوٹ گیا تھا۔زبردستی کھلانے کی کوشش کرتے تو گلے میں ہی اٹک کر رہ جاتا۔بات چیت بھی کم ہی کرتے تھے اور نقاہت بھی محسوس کرتے تھے۔ایک دن ابو نے اپنے معالج ڈاکٹر فاروق صاحب کو اصرار کر کے گھر بلوایا اور ان سے اپنی کیفیت کے بارے میں معلوم کیا۔اگلی صبح میں حسبِ معمول اُنکے کمرے میں گئی تو کہنے لگے کہ میں نے ایک انتہائی ضروری بات سب کو بتانی ہے۔میں متوجہ ہوئی تو کہنے لگے کہ میں نے کل شام ڈاکٹر صاحب کو اس لئے بلوایا تھا تا کہ تصدیق کر لوں کہ میں زندہ ہوں یا نہیں پھر کہنے لگے کہ کل مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس دنیا سے چلا گیا ہوں اور تم شاید میری بات کا یقین نہیں کرو گی لیکن میں واقعی چلا گیا تھا اور میں نے دیکھا کہ مولانا مودودیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، میاں طفیل محمدؒ اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ سب اکٹھے ہیں اور مجھے اپنے پاس بلا رہے ہیں کہ تم بھی جنت میں آ جاؤ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے نئی زندگی دے کر واپس بھیج دیا اور میرا نیا نام ابوبکر رکھا ہے اور کہا ہے کہ اب تم کھاؤ پیو گے۔میں اُنکی بات غور سے سنتی رہی اور پھر انہیں کہا کہ میں آپ کی بات کا بھلا کیوں یقین نہیں کروں گی،آپ نے تو کبھی غلط بیانی نہیں کی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے تو کچھ بھی بعید نہیں۔

اُس صبح سے یہ معجزہ ہم گھر والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جس مریض کے لئے چند گھنٹے پہلے تک ایک گھونٹ پانی بھی نگلنا نا ممکن بنا ہوا تھا،اُسی نے اپنے منہ سے مانگ کر کھانا پینا شروع کر دیا۔

اس نئی زندگی اور مزید مہلت عمل میں ابو نے ایک کتاب لکھنے کی خواہش ظاہر کی اور پھر ہمیں لکھوانی شروع کی۔اس دوران بلا کسی وقفے کے صبح سے رات تک ابو مولانا مودودیؒ کی تمام تصنیفات باری باری پڑھواتے،کلیاتِ اقبال میں سے اشعار نوٹ کرواتے اور تمام اخبارات کے پورے پورے اداریے سنتے۔ان آخری دنوں میں ہم تین بھابیوں نے (جو کہنے کو تو ابو کی بہوئیں تھیں،لیکن ابو ہم سے بیٹیوں کی طرح ہی پیار محبت کرتے تھے)،دن رات باری باری ابو کے خیالات کو قلمبند کیا اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ اُن کی تحاریر کو ان کی خواہش کے مطابق کتاب کی شکل میں مجتمع کر سکیں۔

ابو نے جیسی بھرپور زندگی گزاری ہے،اسکا تذکرہ تو کیا جا سکتا ہے،لیکن اس کا صحیح ادراک اور احاطہ ممکن نہیں۔ان سے زیادہ اصول پسند،نفیس،صاف ستھرا رہنے والا،وقت کا پابند،وعدے کا پابند،اللہ پر توکل کرنے والا،انفاق فی سبیل اللہ کرنے والا،اللہ کے دین کی سر بلندی کی جدوجہد کرنے والا،صوم وصلوٰۃ کا پابند ہر معاملے میں Perfectionist میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔

وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ان جیسے لوگ آج کے دور میں ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ان کی محبتیں اللہ کے لئے تھیں۔ان کی عداوت بھی اللہ کی خاطر تھی۔ان کا دینا بھی اللہ کے لئے تھا اور روکنا بھی اللہ کی خاطر تھا۔مجھ سے بھی اسی لئے خاص محبت کرتے تھے کہ میں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کچھ نہ کچھ کوشش کرتی،اگرچہ ناکام ہی سہی میرے بچوں سے بھی خصوصی لگاؤ تھا اور ہم سب کو بہت دعائیں دیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی تمام حسنات کو بڑھا چڑھا کر قبول فرمائے اور

کوتاہیوں سے درگزر فرمائے ۔صبر سے کاٹی ہوئی اس طویل بیماری کو ان کے حق میں توشۂ آخرت اور درجات کی بلندی کا ذریعہ بنائے ۔ احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوتے ہیں۔ہم اللہ تعالیٰ سے یہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمارے محترم والد کو جنت الفردوس میں بلندترین مقام عطا فرمائے اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے آمین۔

جن خوش قسمت لوگوں کے والدین ابھی زندہ ہیں، ان سے یہ درخواست ہے کہ وہ جنت کمانے کا یہ نادر موقع ہرگز ضائع نہ ہونے دیں ۔ ان کی قدر کریں اور جہاں تک ہو سکے ان کی خدمت کریں۔والدین راضی ہوں گے تو رب بھی انشاءاللہ راضی ہوگا ورنہ تو خدانخواستہ حسرت ، ندامت اور پچھتاوے ہی انسان کا مقدر بن جاتے ہیں ۔اللہ ہمیں ایسی پشیمانیوں سے بچائے اور اپنے والدین کے حقوق ادا کرنے والا بنائے ۔آمین

جہاں تک ہمارے پیارے والد کا معاملہ ہے، اُن کے لئے تو بس شاعر کا یہ شعر ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے کہ:

؎ مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

ڈاکٹر ثمین ذکا

داستانِ عطا و بخشش

ایمرجنسی میں سب کچھ جلدی ہو جاتا ہے۔ اسی ہسپتال میں تقریباً ڈھائی سال پہلے آپریشن ہوا تھا فائل ادھر ہی تھی۔ دو گھنٹے بعد وارڈ سسٹر نے مجھے کہا مریض بہتر ہے تم دیکھ سکتی ہو۔ ڈرپ (Drip) لگی ہوئی تھی اور طبیعت بہتر نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھی تو بچوں کا خیال آ گیا۔ انہوں نے بھی کہا کہ اب جاؤ کل آ جانا۔ بھائی آصف بھی آنا چاہ رہا تھا مگر اسے بھی اگلے روز آنے کو کہا ڈاکٹر ذکاء کی بہن اور بہنوئی واپس پاکستان جا چکے تھے۔

بچوں کو لیکر گھر آئی۔ بہن سعیدہ نے اپنی عادت کے مطابق کھانا ساتھ دے دیا۔ اس روز دن کے چار بجے تھوڑی دھوپ تھی اتوار کا دن تھا۔ ہم باہر ہی بیٹھ گئے بچے سائیکلیں چلانے لگے میں دل میں مسلسل دعائیں کرتی رہی۔ ساڑھے چار بجے گھر کے اندر جا کر مغرب کی نماز بچوں نے بھی میرے ساتھ ادا کی۔ تھوڑی دیر ٹی۔ وی دیکھا تو سونے کا وقت ہو گیا۔ کافی دیر بچوں کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ پھر سوچا عشاء پڑھوں اور سو جاؤں کل پھر ہسپتال جانا ہے۔

رات کے ساڑھے دس بجے فون کی گھنٹی بجی۔ ادھر سے ہسپتال کی نرسیں بول رہی تھی کہ مریض کی حالت تشویشناک ہے۔ مجھے سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ پوچھا کہ کونسے مریض کی؟ پھر وہ تفصیل سے گویا ہوئی ''آج صبح تم اپنے شوہر کو ادھر داخل کرانے آئی تھی اس کی حالت اچھی نہیں ہے'' ''کیا تم آ سکتی ہو؟'' ذرا وقفہ کے بعد بولی۔ میرے یکدم ہوش اُڑ گئے ''ہاں آ رہی ہوں''۔ اسی وقت مسز پیٹرسن کو فون کیا اویس اور عائشہ گہری نیند سو رہے تھے۔ مسز پیٹرسن بھی آ کر نیچے صوفہ پر لیٹ گئی۔ بڑی گاڑی سٹارٹ ہو گئی۔ سڑکوں پر رات کے گیارہ بجے سناٹا چھایا ہوا تھا کوئی غیبی قوت مجھے حوصلہ دے رہی تھی۔

ہسپتال پہنچ کر دیکھا وہاں تو سین ہی کچھ اور تھا چہرے پر مصنوعی سانس دینے والی مشین لگی تھی ڈاکٹر پاس کھڑا تھا۔ میرے پیٹ میں اتنا شدید درد ہوا لگتا تھا گر جاؤں گی۔ سسٹر سے دوائی لی۔ پھر ڈاکٹر سے پوچھا کیا یہ اس کے بغیر سانس لے سکتے ہیں اس نے انکار میں جواب دیا۔ گُردے فیل ہو گئے تھے۔ اتنی دیر میں بھائی آصف کو بھی فون کر دیا۔ وہ مولانا صاحب کو لیکر آ گئے۔ انہوں نے سورہ یٰسین پڑھی، چہرے پر چادر ڈال دی گئی اور کہانی ختم ہو گئی.....

بھائی آصف نے میری طرف آنے کی اجازت مانگی تو اسے کہا اپنے گھر جا کر پاکستان فون کرو اور یہاں پر جو بہت قریبی عزیز اور دوست ہیں انہیں بتائیں۔

خود گھر آ کر اس خاتون کو روانہ کیا وضو کیا نوافل ادا کرنے لگی۔

سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ فجر کے ساتھ ہی سب سے پہلے اختر صاحب اور ان کی بیگم سعیدہ آئے۔ وہ وصیت بھی ساتھ لے آئے تھے۔ ان لوگوں نے دعا کی مگر میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلتا تھا۔ بچوں کی پھوپھو نسرین نے کہا میں فوراً کراچی سے آ رہی ہوں انتظار کریں ورنہ مجھے کبھی یقین نہ آئے گا۔ اسی سال کی گرمیوں میں وہ تینوں بیٹوں کے ساتھ ہمارے ہاں چھٹیاں گذارنے آئی تھیں۔ لاہور اور کراچی سے بے شمار فون آئے بلکہ ان کے بھائی معین نے بہت کہا لاہور میت لے کر آئیں مگر انہوں نے وصیت میں لکھا تھا، جہاں فوت ہوں وہیں پر دفن کرنا ہے.....ان کے لیے گلاسکو شہر کے باہر ایڈنبرا روڈ پر رب کائنات نے جگہ مقرر کی ہوئی تھی۔

کئی روز تک تعزیت کیلئے سب لوگ آتے رہے۔ نسرین بہن

بھی چند روز کے بعد کراچی چلی گئیں۔ بھائی آصف روزانہ چکر لگاتے تھے۔ مجھے پیٹ درد کے دورے پڑنے لگے۔ تمام ٹیسٹ ٹھیک آئے تھے، ساتھ ہی اتنا شدید فلو ہوا۔ بخار اتنا زیادہ تھا، ڈاکٹر گھر دیکھنے آیا۔ بچے بھی پریشان سے لگ رہے تھے مگر ایسے محسوس ہوتا تھا کچھ بھی میرے بس میں نہیں دماغ بھی بند ہو گیا تھا.....انہیں دنوں ایک دوپہر میری آنکھ لگی ذرا سا خواب دیکھا۔ ڈاکٹر ذکاء پلنگ کے کونے میں بیٹھے ہیں۔ میرے پیٹ میں جہاں درد ہوتا تھا وہاں ہاتھ رکھا اور بولے ''بس اتنی تکلیف سے گھبرا گئی ہو''؟ میری آنکھ کھل گئی۔ یوں محسوس ہوا روحیں قریب ہی ہوتی ہیں۔

لاہور سے والدین کے بھائی بہنوں کے بے شمار خطوط آ رہے تھے انہیں یہ انتظار تھا کہ میرا کیا فیصلہ ہوگا وہاں رہنا ہے یا پاکستان آنا ہے۔

ہارٹ وڈ ہسپتال کے ڈائریکٹر ڈاکٹر نیل گریم (Neil Gram) تعزیت کیلئے آئے تو مجھے یہ مشورہ بھی دیا اگر میں چاہوں تو اپنے ہسپتال میں سروس بھی دے سکتے ہیں اور فلیٹ بھی اس گھر کو کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا سوچ کر بتاؤں گی۔ اس روز سے نہایت سنجیدگی سے استغفار شروع کر دیا۔ ایک تو دن میں نفل پڑھنے کے بعد دعا، استغفار پڑھتی تھی دوسرے رات کو سونے سے پہلے سورہ فاتحہ سے مدد لیتی تھی۔ یہ وظیفہ باجی ہاشمی صاحبہ نے مجھے کالج کے دنوں میں بتایا تھا۔ اوّل آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ 11 مرتبہ سورہ فاتحہ اور پھر 11 مرتبہ سورہ اخلاص **ایاک نعبد وایاک نستعین** دل کی طرف فوکس کرنا ہوتا ہے۔

اکثر ایسے ہی خواب آتے تھے۔ سکاٹ لینڈ کی برف میں گاڑی پھنس گئی ہے یا فلیٹ میں بیٹھے ہیں اور ساتھ ہی ڈاکٹرز کے میس (Mess) سے شراب کی بُو آ رہی ہے اور اونچی آواز میں میوزک لگا ہوا ہے۔ پاکستان کے اچھے خواب ہوتے تھے۔ اذانوں کی آوازیں آ رہی ہیں، باغ میں بچوں کے ساتھ سیر کر رہے ہیں۔

اللہ تبارک تعالیٰ کا کرم ہوا چند دن کے اندر دل میں اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس ملک کو خیر باد کہنا ہے اور گھر بیچ کر کشتیاں جلا کر ہی پاکستان سیٹ ہوں گے۔

بھائی جان طارق کا تعزیت کا خط

مرحوم ڈاکٹر محمد ذکاء الدین سے بھائی جان کی سکول کے زمانہ سے دوستی تھی۔ ہماری شادی کے بعد وہ دو مرتبہ سکاٹ لینڈ بھی آئے۔ 1966ء میں چند روز کیلئے گرمیوں میں کورس کا وقفہ تھا۔ وہ پورٹ سمتھ میں بحری جہاز رانی کے شعبہ میں ایک خصوصی پروفیشنل کورس کر رہے تھے۔ پھر 1977ء میں روڈ آئلینڈ، امریکہ میں امریکی بحریہ کے کمانڈ کالج میں اعلیٰ سطح کا تعلیمی اور پروفیشنل کورس مکمل کر کے پوری فیملی کے ساتھ چند دن کے لیے سکاٹ لینڈ میں ہمارے پاس رُکے تھے۔

تعزیتی خط میں انہوں نے لکھا ہوا تھا کہ ذکاء مرد مومن تھے اور جس زمین پر مرد مومن دفن ہوتا ہے تاریخ شاہد ہے وہاں اسلام ضرور پھیلتا ہے۔ آج اتنے سالوں بعد اس بات کی سچائی نظر آ رہی ہے۔ پورے برطانیہ میں سب سے زیادہ اسلام کا چرچا گلاسکو میں ہے۔

شہر کے چاروں کونوں میں ہر روز کہیں نہ کہیں درس قرآن، اجتماع، ذکر اللہ یا عربی کی کلاس ہو رہی ہوتی ہے اور خط میں اس بات کی تاکید کی تھی کہ **ان اللہ مع الصابرین** زیادہ پڑھنا چاہیے اور ان الفاظ کی طرف دیکھنا بھی چاہیے۔

طارق بھائی کے اندر خصوصی اللہ تعالیٰ سے تعلق رہا ہے۔ کچھ بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ والدہ بتایا کرتی تھیں کہ دو بیٹیوں کے بعد جب بیٹا آیا تو ہمارے پردادا حاجی احمد بخش کو بے اندازہ خوشی ہوئی۔ چند روز بعد تشریف لائے بھائی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا، ماتھا چوما اور دل سے دعائیں دیں۔

بھائی جان کا نیوی کا دور اللہ کے فضل و کرم سے بڑی کامیابی سے گذرا۔ کبھی فرصت میں دلچسپ واقعات سناتے تھے۔

دلچسپ واقعات

اپریل 1971ء میں پاک بحریہ کے جہاز پی این ایس ''مددگار''

کے کپتان تھے۔ایک لمبے سمندری سفر پر گئے۔مغربی افریقہ کے ملک سینی گال کی بندرگاہ سے پاکستان بحریہ کے لیے فرانس میں تیار شدہ آبدوز کوحفاظت کے ساتھ اپنے جہاز کے ہمراہ کراچی لانا تھا۔جاتے ہوئے مشرقی افریقہ کے ملک موزنبیق کی بندرگاہ لورینزو مارک رُکنا تھا۔بندرگاہ میں پہنچنے کا راستہ ایسی گزرگاہ کے ذریعہ تھا جہاں پانی کی گہرائی کم تھی اور جہاز رانی کا راستہ تنگ تھا۔ان کا جہاز کسی وجہ سے ایک خطرناک موڑ پہ پہنچ کے کم گہرائی ہونے کے باعث وہاں پھنسنے لگا۔بھائی جان نے بتایا کہ انہوں نے گڑگڑا کے دل میں اللہ تعالیٰ کو پکارا اور رحم وکرم کی دعا کی۔چند نہایت تشویشناک منٹوں کے بعد یکا یک جہاز اس مشکل سے نکل کے گہرے پانی اور گزرگاہ کے صحیح راستے پہ آ گیا۔

انڈونیشیا کے ایک دور دراز خطے ویسٹ ایریان کا بڑا دلچسپ واقعہ بتایا۔1962ء کا ذکر ہے۔وہ اقوامِ متحدہ کی طرف سے پاکستان کے بری اور بحری دستوں کے ساتھ وہاں گئے ہوئے تھے اور ایک خاصے بڑے لینڈنگ کرافٹ کی کمانڈ کر رہے تھے۔اس جہاز میں ضروری پروفیشنل اہلیت رکھنے والے عملے کی کمی تھی۔اس لیے زیادہ وقت وہ خود ہی اوپر کمانڈ سینٹر میں موجود رہتے تھے۔ایک مرتبہ آدھی رات کو جہاز کے متعلقہ چیف پیٹی افسر کو ہدایات دے کر سونے کے لیے نیچے اپنے کیبن میں چلے گئے۔جہاز رانی کے راستہ سے بحفاظت گزر جانے کی انہیں فکر تھی۔انہوں نے اپنے دل ودماغ پہ خاص توجہ مرکوز کر کے خود کو ہدایت کی اگر جہاز کسی مشکل میں جانے لگے تو میں خبردار ہو جاؤں۔

بتاتے ہیں تقریباً تین گھنٹے بعد انہیں گہری نیند میں آواز سنائی دی کہ ''جہاز کو دائیں طرف موڑیں''۔

وہ تیزی سے اوپر کمانڈ سینٹر پہنچے اور جو سیلر جہاز کو دائیں بائیں موڑنے والے ویل (Wheel) پر ڈیوٹی دے رہا تھا اسے دور سے ہی حکم دیا ''ویل کو 40 ڈگری دائیں طرف موڑو۔'' پھر اپنی دوربین سے انہوں نے آگے دیکھا۔سطح سمندر سے باہر نکلی ہوئیں چند چٹانیں بالکل سامنے تھیں۔اگر جہاز فوراً دائیں طرف نہ موڑا جاتا تو چٹانوں سے ٹکرا جاتا،اور عجیب بات تھی کہ جہاز رانی کے نقشہ میں ان چٹانوں کا کوئی نشان نہ تھا!

پڑھنے لکھنے کا شوق وراثت میں ملا ہے۔علامہ اقبال کے بڑے معتقد ہیں۔یاد کرنے کی چیزیں قرآنی آیات یا علامہ اقبال کے اشعار لکھ کر گاڑی میں سامنے رکھ لیتے۔گھر سے دفتر تک یاد کرتے رہتے۔

سروس کے دوران قلمی نام سے کارآمد مضامین لکھنے شروع کر دیے تھے۔دوسرے ملکوں کے بحریہ کے جرائد کے لیے بھی لکھتے تھے۔

نیوی سے ازخود ریٹائرمنٹ لینے کا ارادہ کر لیا۔جولائی 1987ء میں جب کراچی میں بحریہ کے سٹاف کالج کے کمانڈانٹ تھے بحریہ کی سروس کو الوداع کہہ دیا۔ملک کے پالیسی سازوں اور عوام کو پاکستان اور امت مسلمہ کے اصل دشمنوں سے آگاہ کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے بارے میں مطلع کرنے والے مضامین لکھنا چاہتے تھے،جو کہ اب مسلسل دن رات لکھے جا رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی یہ محنت قبول کرے اور اپنی خاص حفاظت عطا کرے۔آمین

سکاٹ لینڈ سے واپسی

جنوری 1978ء کے آخر میں واپسی کا فیصلہ ہوا اور یہ ضروری تھا کہ اپریل تک لاہور پہنچیں تاکہ گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے بچوں کے سکول میں داخلے ہو جائیں۔

تمام ضروری کاغذات مجھے اس بریف کیس سے مل گئے جس کی نشاندہی انہوں نے کچھ عرصہ پہلے کی تھی۔جس ایڈووکیٹ کے ذریعہ گھر خریدا تھا اس کے ذریعہ بیچنے کو لگا دیا۔

اتفاق سے ڈاکٹر ذکاء کی پنشن بھی زیادہ مقرر ہوئی کیونکہ انہوں نے پنشن کی قسط زیادہ کٹوانی شروع کر دی تھی،جب سے معلوم ہوا کہ دل کی حالت اچھی نہیں ہے۔شہر کے سب پاکستانیوں نے ہر معاملہ

میں بے حد مدد دی۔

لاہور سے میری بہن آصفہ سلیم کو بڑی بہن ڈاکٹر تنویر نعیم کے مشورہ سے میرے پاس بھیجا گیا تا کہ ہمیں ساتھ لے کر پاکستان آئیں۔ یہ بھی بہت بڑی امداد تھی۔ حیرت ہو رہی تھی قادر مطلق کیسے قدم قدم پر اپنی خصوصی مدد بھیج رہا تھا۔ اکثر رات کو سورہ فاتحہ کا وظیفہ توجہ سے پڑھتی تا کہ مسلسل ذاتِ باری تعالیٰ رہنمائی فرماتے رہیں۔

چند ماہ پیشتر ہی جاپان سے گاڑی منگائی تھی اور کہتے تھے ''اس ملک میں رہنے کو دل نہیں چاہتا تھوڑی طبیعت بہتر ہو جائے تو اپنے وطن ہی جائیں گے۔''

سکاٹ لینڈ کے گھر میں آخری دن!

گھر بک چکا تھا آخری روز مقررہ وقت پر صبح دس بجے وہ لوگ چابی لینے آ گئے تھے۔ ہم نے دوپہر تک بھائی آصف کے گھر جانا تھا۔ عصر کی نماز وہیں ادا کرنے کا پروگرام تھا۔ قریب کے علاقہ میں ایک کاروباری خاندان کے پاس بڑی وین تھی انھوں نے ہمیں سامان سمیت بھائی کے ہاں لے جانا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے ان کا پریشانی کا فون آ گیا۔

''گاڑی خراب ہے ورکشاپ پہنچادی ہے۔ ہم شرمندہ ہیں۔''

میں نے کہا کوئی بات نہیں کچھ اور بندوبست ہو جائے گا۔

دو بڑے کریٹ بستر اور بچوں کی چیزوں سے بھرے ہوئے کسی عام گاڑی میں پورے نہیں آ سکتے تھے۔

میری بہن مسز آصفہ سلیم سارا وقت میرے ساتھ مدد کراتی رہی تھیں وہ بھی کچھ پریشان ہو گئیں کہ اب کیا ہو گا؟

پورے گھر میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ سامان تو کچھ اللہ واسطے دے دیا کچھ بیچ دیا تھا۔ ہم لوگ ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھے دل ہی دل میں اللہ سے مدد کے لیے دعا کر رہے تھے۔ چونکہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس کو فون کروں؟

تقریباً تین بجے بھائی آصف کا فون آیا۔ ''میں معلوم کرنا چاہتا تھا آپ روانہ ہوئے یا نہیں؟''

''اب کیا صورت حال ہے؟''

میں نے انھیں مختصر باعث پریشانی بتائی۔ وہ بولے ''میں ابھی اسلامک مشن کے بھائیوں سے رابطہ کرتا ہوں بلکہ بھائی خورشید اور بھائی اعظم نے آج صبح ہی مدد کی پیشکش کی تھی مگر ہمیں ضرورت نہ تھی۔''

تقریباً پون گھنٹہ بعد ہمارے گیٹ کے اندر ایک بڑی وین پہنچ گئی۔ آدھے گھنٹہ میں ہم بھائی آصف اور بھابھی سمن کے ہاں پہنچ چکے تھے۔ اس وقت ان کی ایک ہی بچی زینب تھی۔

اگلے روز ہماری لندن کے لیے فلائیٹ تھی۔ وہاں ڈاکٹر ذکاء کے بچپن کے دوست بھائی جاوید قیوم ایئرپورٹ لینے آئے تھے ان کی بیگم عائشہ نے دو روز ہماری بہت دیکھ بھال اور خاطر مدارت کی اور تیسرے روز کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ اللہ کی مدد اور عزیزوں کی ہمدردیاں یاد آتی ہیں تو دل شکر کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔

ان دنوں طارق بھائی جان کی کراچی میں پوسٹنگ تھی۔ والدہ لاہور سے کراچی آئیں ہمیں ملنے کے لیے۔ دو روز قیام تھا۔ تعزیت کے لیے دوست احباب آتے رہے۔ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون اور انجم ہارون ان دنوں کراچی تھے۔ ڈاکٹر فریڈی سٹینا ان کی بیگم دینار سے بھی گلاسگو سے دوستی تھی۔ خالہ کی بیٹی تزین اور بھائی نسیم فاروقی بھی ملنے آئے۔

جو قسمت میں لکھا ہو مل کر رہتا ہے

مرچنٹ نیوی کے ایک کیپٹن کا ڈاکٹر ذکاء نے سال پہلے علاج کیا تھا وہ اپنی نوکری پر بحال ہو گئے جب کیپٹن صاحب کو اطلاع ملی تو ہمیں تاکید کی بڑا سامان جیسے بستر اور بچوں کی بڑی بڑی کھیلنے کی چیزیں بھائی آصف مجید کے گھر چھوڑ جائیں وہ اپنے جہاز پر لے آئیں گے۔ اتفاق سے کاغذات مکمل نہ تھے اس لیے کراچی پورٹ پر ہمارا سامان نہیں اُتر سکتا تھا۔ اسی طرح دو سال جہاز میں رہا پھر کسی

طریقہ پر کیپٹن صاحب نے نکلوالیا اور لاہور پہنچایا بالکل صحیح سالم بچے اپنی چیزیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انہیں دنوں ہم اپنے گھر شفٹ ہوئے تھے۔

لاہور میں اللہ کے فضل سے سکول میں داخلے ہو گئے۔ بڑی بہن کے بچے بھی اسی سکول جاتے تھے اس لیے آسانی ہوگئی۔ دو سال ہم انہیں کے مہمان رہے۔ پہلا سال سب سے مشکل تھا۔ میرا دماغ صحیح طرح کام نہ کرتا تھا اور دل بھی ٹھیک نہ تھا۔ ڈاکٹر نبیہہ حسن نے دوائی دی ہوئی تھی۔ جو بھی عزیز رشتہ دار افسوس کرنے آتے۔ میرے آنسو ہی بہتے رہتے۔ یہ تو معلوم تھا صبر آئے گا مگر کب اور کیسے؟ قرآن پڑھنا اور اچھی دینی کتب اور سیرت پر مختلف کتابیں، یہی میری مصروفیت تھی۔

باجی ہاشمی حیات تھیں انہوں نے دل کے سکون کیلئے سورہ الم نشرح گیارہ مرتبہ عصر کے بعد پڑھنے کو کہا اول آخر درود شریف۔ یہ روحانی نسخہ بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔

ترجمہ: ''کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا، اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اُتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی، اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کیا۔ سو بے شک سختی کے ساتھ آسانی ہے بیشک مشکلات کے ساتھ آسانی ہونے والی ہے۔ تو جب آپ فارغ ہو جایا کریں (تبلیغی احکام سے) تو دوسری عبادات میں محنت کیجئے اور اس میں اپنے رب کی طرف ہی توجہ رکھیں۔''

ایک روز سید عبدالقادر جیلانی کی کتاب الفتح الربانی فیوضی یزدانی پڑھ رہی تھی اس میں ایک جمعہ کا خطبہ ایمان پر تھا اور لکھا تھا بندے کے دل میں اگر ''کیوں'' آئے تو اس کا مطلب ہے ایمان نامکمل ہے..... آگے علاج نہ لکھا تھا۔ باجی ہاشمی سے کہا میرے دل میں کئی بار یہ خیال آتا ہے کیوں اتنی جلدی فوت ہو گئے تھوڑے سال اور مل جاتے..... تو انہوں نے کہا پہلا کلمہ کثرت سے پڑھو بلکہ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھ لیا کرو۔

میں نے یہی کیا اور چند روز میں دل مطمئن ہو گیا۔ بیٹی تو جلدی سیٹ ہوگئی مگر اویس بیٹے کو تھوڑا وقت لگا، کئی ایک جاننے والوں نے کہا ''اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے باپ بھی گیا اور جگہ میں بھی اتنی بڑی تبدیلی'' مگر مجھے یقین تھا اللہ تعالیٰ اس کو بھی سیٹ کر دیں گے اور یہی ہوا دو سال بعد ہم نے اسی علاقہ میں اپنا گھر لے لیا تو اویس بیٹا جلد سیٹ ہو گیا۔ قریبی رشتہ داروں اور بڑی بہن کے سسرال جو بالکل قریب رہتے ہیں بچوں کا بہت خیال کیا اللہ تعالیٰ انہیں بہترین اجر سے نوازے۔ آمین

اب اللہ کے فضل سے میری صحت بہت بہتر تھی کسی حد تک صبر بھی آ گیا تھا اس لیے سروس کرنے کا موڈ ہو گیا میری ایک ڈاکٹر سہیلی کے ذریعہ بہت اچھی سروس مل گئی مگر جب گرمی شروع ہوئی تو چکر آنے لگے اس لیے کام چھوڑنا پڑا۔

گھر میں رہتے چند دن ہوئے تھے دل میں پھر سے 'کیوں' آ گیا اور شیطان نے علاج بھلا دیا..... بچوں کی پھوپھی کے ہاں ایک روحانی بزرگ آئے۔ ہم تینوں کو انہوں نے دعائیں بتائیں اور 'کیوں' کا علاج پہلا کلمہ طیبہ ہی بتایا۔ اب دل میں اس کلمہ کی اہمیت اتنی گہری نقش ہوگئی کہ کبھی بھولنے والی نہیں انشاء اللہ تعالیٰ..... یہی تو وہ الفاظ ہیں جب دل میں اُترتے ہیں تو ایمان یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے اور مسلمان کو اللہ کی رضا میں راضی ہونا آتا ہے۔

درسِ قرآن کا سلسلہ

بہت اچھی بات یہ ہوئی کہ مسز رفعت حنیف (قلمی نام بنت الاسلام) نے ریٹائرمنٹ کے بعد ہفتہ وار درس شروع کر دیا۔ ویسے بھی وہ مجھے بہت پسند تھیں جب بھی طبیعت اداس ہوتی انہیں فون کرتی تو وہ بلا لیتیں اور بہت اچھی اچھی باتیں بتاتیں۔ ایک مرتبہ مناجات مقبول (مولانا اشرف علی تھانوی) تحفہ دی اور کہا ''ان دعاؤں کو زندگی میں بہت مفید پایا'' ہفتے کے سات دنوں کی دعائیں قرآن اور حدیث سے ایک جگہ اکٹھی کی ہوئی ہیں۔

آپا جی بنت الاسلام کے درسِ قرآن میں بہت لطف آتا

تھا۔ وہ ہمارے بڑے بہنوئی ڈاکٹر نعیم اقبال کی سب سے بڑی ہمشیرہ تھیں۔ قلمی نام بنت الاسلام، جبکہ والد نے رفعت اور والدہ نے نسیم آرا نام رکھا تھا۔ لاہور کالج فار وومن میں اسلامیات کی ہیڈ ریٹائر ہوئیں۔ بہت سال ''بتول'' کی ایڈیٹر رہیں۔

چالیس منٹ قرآن پڑھتے بیس منٹ حدیث اور دس منٹ میں دعا سے پہلے دو قسم کی تسبیحات پڑھتے۔ وہ نہایت مخلص اور باعمل خاتون تھیں دعا کے بعد جن خواتین کے کچھ مسائل ہوتے وہ ان سے مشورہ بھی کرتیں۔

کبھی کبھی تقسیم ہند کے واقعات اور اپنے بچپن کے حالات بھی بتاتی تھیں ایک مرتبہ انہوں نے بڑا دلچسپ خواب سنایا۔ یہ خواب آپا جی نے اپنے والد مولانا ظفر اقبال سے سنا۔ مولانا اصغر علی روحی اسلامیہ کالج میں اسلامیات کے پروفیسر تھے، اور مولانا ظفر اقبال صاحب سے کافی دوستی تھی جو کہ اس زمانہ میں کیمبل پور (اٹک) کالج میں پرنسپل تھے۔ آپا جی کے والد صاحب نہایت بلند پایہ باعمل عالم دین تھے۔ پاکستان کو وجود میں آئے تھوڑا عرصہ ہی گذرا تھا۔

مولانا روحی نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں آپ کے ایک طرف صحابۂ کرام تشریف رکھتے ہیں اور دوسری طرف قائداعظم محمد علی جناح آپ کے بالکل قریب بیٹھے ہیں۔ خواب ہی میں مولانا روحی پوچھتے ہیں یہ آپ کے اتنے قریب بیٹھے ہیں؟ تو آپ ﷺ جواب میں فرماتے ہیں ''ہاں یہ وہ شخص ہے جس نے میری امت کو اکٹھا کیا''! اس زمانہ میں کچھ مولوی لوگ قائداعظم کی داڑھی نہ ہونے کی وجہ سے باتیں بنایا کرتے تھے۔ اس خواب کے بعد ان دونوں دوستوں نے کبھی بھی قائداعظم کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔

تھوڑی خواتین ایسی تھیں جو قرآن کی کلاس سے آدھا گھنٹہ پہلے آتیں اور عربی گرامر بھی سیکھتی تھیں تھوڑا عرصہ میں بھی شامل رہی مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ ایسا مضمون ہے دوسروں کو پڑھائیں گے تو یاد رہے گا ورنہ بھول جائے گا۔

آپا جی مجھ سے اکثر میڈیکل کیمپ کے بارے میں پوچھتی رہتیں۔ جب کوٹ جہانگیر خان جانا بند ہو گیا تو مجھے کہنے لگیں کہ محترمہ ام راشد سے رابطہ کرو وہ بھی یہ کام اپنے طور پر کر رہی ہیں، لاہور سے باہر درسِ قرآن کے لئے جاتی ہیں جو مریض لاعلاج پڑا ہوتا ہے اسے اپنی جیپ میں ڈال کر لاتیں اور لاہور کے ہسپتال میں علاج کرواتی ہیں۔

آپا جی کے مشورہ کے مطابق محترمہ ام راشد سے رابطہ ہوا اور ملاقات کا وقت اور جگہ مقرر ہوئی۔

کوٹ جہانگیر خان میں میڈیکل کیمپ

میڈیکل کے شعبہ میں کہاں کام کرنا چاہیے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کہیں فری ٹائم دینے پر دل راغب نہ ہوتا تھا۔ روزانہ رات کو سورہ فاتحہ کا وظیفہ پڑھتی اور اللہ تعالیٰ سے پوچھتی ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' ایک رات خواب دیکھا سورہ محمد اور سورہ فتح پڑھ رہی ہوں۔ عصر کی نماز کے بعد یہ دونوں سورتیں پڑھنی شروع کر دیں۔ چند ہی دنوں میں ایک جگہ آپا نعیمہ جہانگیر خان اور محترمہ خورشید نیازی صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ میری مصروفیات کا پوچھتی رہیں۔ میں نے باہر دیہات میں بھی کچھ علاج کے طریقہ کا بتایا تو آپا نعیمہ نے بڑے شفیق لہجہ میں کہا ''ہمارے گاؤں سے کام شروع کرتے ہیں'' یکدم بات میرے دل کو پسند آئی۔ محترمہ خورشید نیازی بھی انسانی ہمدردی رکھتی تھیں۔ دونوں نے گرل گائیڈ میں بھی نوجوان لڑکیوں کو ادب آداب سکھانے اور کردار سازی میں بہت سال لگائے تھے۔

بیگم نعیمہ جہانگیر خان کے گاؤں کوٹ جہانگیر خان میں کام کا نظام سیٹ ہو گیا۔ وہاں حویلی میں ہر پندرہ دن بعد میڈیکل کیمپ لگتا تھا دوائیاں ساتھ لے کر جاتے تھے۔ آپا نعیمہ جہانگیر خان زیادہ تر ہلکی پھلکی دین کی تعلیم بھی دیتی تھیں۔ کبھی ڈاکٹر زینب بھی جاتیں اور مسز ریحانہ رفیق بھی بہترین مددگار ثابت ہوتیں۔

ہم زیادہ تر صحن میں ہی مریضوں کو دیکھتے تھے۔ کیونکہ حویلی

بہت پرانی تھی اور کمرے زیادہ وقت بند رہتے تھے، تازہ ہوا کا فقدان تھا۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر نبیہہ حسن بھی ہمارے ساتھ تشریف لے گئیں تو اس جگہ کو دیکھ کر مشورہ دیا ''حویلی گرا کر یہاں نیا ہیلتھ سینٹر بننا چاہیے ورنہ یہ جگہ صحت کے حوالہ سے مضر ثابت ہوگی۔'' بیگم نعیمہ جہانگیر صاحبہ کی حویلی اور زمین تھی۔

بہاری کالونی میں میڈیکل کیمپ

1970ء کی دھائی کے شروع میں ہی بہت سے بہاری لوگ پاکستان آئے تو ان کے لیے تقریباً تین سو کے قریب پانچ مرلہ کوارٹر حکومت نے بنائے تھے۔ ایک گھر میں تقریباً 12/13 افراد رہتے تھے ان کیلئے کوئی علاج کی سہولت نہ تھی۔

یہ آبادی لاہور میں ٹاؤن شپ اور گرین ٹاؤن کے درمیان واقعہ ہے سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ ہوا کہ اس آبادی میں بوڑھے اور بچے بھی بہت ہیں۔ یہاں سے شروع کرنا چاہیے۔ ام راشد نے گاڑی مہیا کرنے کی ذمہ داری لی اور دوائیاں ہم اپنے ذاتی صدقات اور زکوٰۃ سے خریدتے۔ مددگار خواتین بیگم عامر اور آپا ساجدہ تھے۔ یہ دونوں نہایت مخلص خواتین جذبہ خدمت خلق سے سرشار تھیں۔ بھارت سے ہجرت کر کے لاہور سیٹ ہوئیں۔ دونوں پڑھی لکھی اور دین سے محبت رکھنے والی تھیں۔ اس کے بعد ایک روز آپا ام راشد ایک نئی نسبتاً جوان خاتون گُل رعنا کو لے کر آئیں چونکہ رجسٹر پر اندراج بھی کرنا ہوتا تھا۔ گل رعنا نے بھی بہت شوق سے ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

فنڈز کا بندوبست

بہاری کالونی میں بہت غربت تھی دل چاہتا تھا کہ ان کی کسی طرح مالی امداد کی جائے مگر ہمارے وسائل محدود تھے۔ ایک روز ہم لوگ اس جگہ مریض دیکھ رہے تھے کہ آپا ام راشد کے ساتھ ایک اور سہیلی بیگم فرحت روشن آئیں جو اپنی زکوٰۃ دینا چاہتی تھیں۔ انہیں بتایا کہ یہاں اس چیز کی بیحد ضرورت ہے کچھ کمزور بچوں اور بوڑھوں کو دودھ کیلئے وظائف شروع کر دیئے۔ اسی طرح کچھ اور لوگوں کو اس پروجیکٹ کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی اللہ واسطے کی رقوم ادھر دینا شروع کر دیں۔ حالات کچھ بہتر صورت اختیار کر گئے۔ تقریباً دو سال بہاری کالونی ہفتہ وار جاتے رہے۔ (جاری ہے)

☆☆☆

دیرینہ خواہش تھی کہ بیت اللہ اور دیارِ حبیب کو جاؤں اور عمرہ یا

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا

حج کی سعادت کروں۔ خدا کا وہ پہلا گھر جو پہلی بار اس زمین پر بنایا گیا اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ یہ خواہش ایک دو دن نہیں برسوں پر محیط تھی اور سینے میں پل پل کر توانا ہو چکی تھی مگر ہنوز کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی، والا ہی معاملہ تھا۔ بس چپکے چپکے اپنے رب کے سامنے درخواست گذار رہتی جو دلوں کا حال جاننے والا ہے جو ہم سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ حال یہ تھا کہ

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں
حسرت آتی ہے وہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں

لیکن آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جب بارگاہ ایزدی میں درخواست قبول ہوئی، اذن خداوندی ہوا خبر آئی آپ کا ویزہ منظور ہو کر آ گیا ہے۔ شکر ادا کیا اور سفر کی تیاری شروع کر دی۔ مکے اور مدینے کا مقدس سفر، حصول سعادت کا سفر، اس جگہ کا سفر جو دنیا کے تمام مسلمانوں کا روحانی مرکز ہے، اس خانۂ خدا کی زیارت کا سفر جو آج بھی مرکز نگاہ ہے۔ اس سرزمین کا سفر جس کے کوہستانوں ریگستانوں گلیوں اور وادیوں میں اس عظیم ہستی کے نقش پا ہیں جو اس خانۂ خدا کی رکھوالی، اس کی حاکمیت اور اس کے دین کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا۔ جو محبوب خدا ہے جس سرزمین کے در و بام میں اس کی محبت رچی بسی ہوئی ہے۔ جس کی فضاؤں میں رحمت اور برکت ہے۔ ہر قدم پر احساس ہو رہا تھا کہ یہ ایک عظیم سفر ہے جس کی لوگ آرزوئیں کرتے گذر جاتے ہیں۔ سفر تو پھر سفر ہے پہلے بھی یہ مشکل تھا آج بھی یہ مشکل ہے جب ہی تو ہمارے محبوبؐ خدا نے سفر پہ جانے سے پہلے لوگوں سے مل کر دلوں کو صاف کر لینے کا حکم دیا ہے۔

آٹھ اپریل کی صبح ہمیں روانہ ہونا تھا رات تک خبر ملی کہ عرب امارات کے جہاز سے براستہ دوبئی جانا ہوگا۔ دوبئی ائیر پورٹ پر گیارہ گھنٹے کے انتظار کے باعث یہ سفر تقریباً 28 گھنٹے پر محیط تھا۔ سفر اتنا طویل اور میں ایک بیمار اور کمزور وجود۔ بڑی مشکل آ پڑی تھی نہ جانے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ۔ انکار کروں تو سعادت سے محرومی اور جاؤں تو مشکل کا سامنا بہر حال جانے کا فیصلہ کر لیا مگر حالت دگرگوں تھی۔ دل پہ گھبراہٹ، دماغ پریشان، وجود لرزاں، پریشانی یہ تھی کہ سفر طویل، راستہ انجانا، کوئی ساتھی نہ ہمسفر، کوئی تجربہ نہ معلومات۔ صرف اپنے چھوٹے بیٹے کا ساتھ وہ بھی نا تجربہ کار۔ بہر حال روانگی کا وقت آ ہی گیا۔ دھڑکتے دل اور کانپتے وجود کے ساتھ اندر جانے کے لئے قدم آگے بڑھایا۔ اپنی کم مائیگی پر ندامت کا احساس اور زیادہ بوجھل کر رہا تھا۔ حال یہ تھا کہ

چلا ہوں ایک مجرم کی طرح میں جانبِ طیبہ
قدم لرزیدہ لرزیدہ بدن لرزیدہ لرزیدہ

قواعدِ سفر کے پیچیدہ مراحل طے کرنے کے بعد جہاز پہ سوار ہونے کا مرحلہ آیا جس کی سواری قدرت کا عظیم اور حسین کرشمہ ہے۔ یہ قدرت کا عظیم ہاتھ ہے جو اتنے بڑے جہاز کو فضاؤں میں یوں تھامے رہتا ہے جیسے کوئی معمولی کھلونا ہو بلندی پہ اڑتے ہوئے اپنی پستی کا احساس ہو رہا تھا۔ بادلوں میں اور حسین روشنیوں کے درمیان سفر کرتی مدینہ ائیر پورٹ پہنچی۔ 24 گھنٹے کے سفر کے بعد جسم تھکاوٹ سے چور تھا لیکن ہمیں ابھی مکہ جانا تھا لہٰذا فوراً بذریعہ ٹیکسی چھ گھنٹے کے مزید سفر کے بعد مکے پہنچے سفر طویل پیچیدہ اور پر مشقت تھا لیکن

کسی کے ہاتھ نے بڑھ کر سہارا دے دیا ورنہ
کہاں میں اور کہاں وہ راستے پیچیدہ پیچیدہ

ٹیکسی نے جس جگہ اتارا سامنے حرم شریف کا وسیع و عریض صحن

تھا۔ظہر کی نماز ادا کی جارہی تھی یہ منظر ہمیشہ میرے لئے دل خوش کن اورروح پرور رہا ہے۔دل جذبات سے لبریز ہوگیا۔آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اس جگہ پہنچ چکی ہوں جس کی مدت سے آرزومند تھی۔یہ تو وہی منظر ہے کہ جس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں۔

سامان وہیں چھوڑ کر نماز کے لئے آگے بڑھی۔صحن حرم میں نماز ادا کی یہ اس سرزمین پر میرا پہلا سجدہ تھا۔نماز سے فارغ ہوکر ٹھکانے کی تلاش شروع کی خواہش تو یہ تھی کہ جگہ حرم سے قریب ہولیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا پر مشقت جدوجہد کے بعد جگہ ملی لیکن وہ حرم شریف سے بہت دور تھی گویا میرے رب نے یہ چاہا کہ میں اس کی راہ میں زیادہ سے زیادہ چلوں اور آبلہ پائی کا لطف اٹھاؤں شاید اسے مجھ عاصی و ناتواں کو زیادہ اجر دینا مطلوب تھا۔

میقات پہ ہم ماہ بیٹے احرام پہن چکے تھے، اب اگلہ مرحلہ عمرہ کی ادائیگی کا تھا اور اسی کے لئے تو سارے مراحل طے کئے تھے۔اب خانۂ کعبہ تک پہنچنا تھا جو دل ونگاہ کا اصل مرکز ومحور ہے۔پہلا اور دوسرا زینہ طے کر کے اب میں تیسرے زینے پر کھڑی تھی۔نظر اٹھائی تو سامنے خانۂ خدا اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ رونق افروز تھا۔پہلی نگاہ پڑتے ہی دل کی دنیا میں ہلچل مچ گئی، آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔میں اسے دیکھ رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا رب کعبہ مجھے دیکھ رہا ہے۔نگاہ دل میں اترتی محسوس ہورہی تھی جیسے میرا رب میرے اندرون کا گہری نظروں جائزہ لے رہا ہو۔دل نے گواہی دی، زبان نے اقرار کیا یہ وہی خدا ہے جو نظم ہستی چلا رہا ہے، جو پوری کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، جسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ جس کی گرفت میں میری اور سب کی جان ہے۔آنکھوں سے اشک رواں تھے۔زبان کہہ رہی تھی اے میرے رب میں اس قابل نہ تھی کہ تیرے در پہ آسکتی تو نے مجھے اس قابل کیا۔میرا آنا ممکن نہ تھا اگر تو نہ بلاتا۔تو نے مجھے بلایا، اپنا مہمان بنایا، اپنے گھر کی زیارت نصیب کی، میری آنکھوں کو وہ کچھ دکھایا جو تیری مدد کے بغیر کبھی نہ دیکھ سکتی تھی۔شکر وسپاس کے جذبے سے پورا وجود لرز رہا تھا۔احساسِ ندامت کے اشکوں سے چہرہ تر تھا۔پورا وجود اس کے سامنے تحلیل ہوتا محسوس ہورہا تھا جیسے میں کچھ بھی نہیں ہوں..... کچھ بھی تو نہیں، بس ایک مشت خاک جسے ہوا میں بکھیر دیا جائے، ایک بلبلہ جو بنتے ہی ٹوٹ جائے..... پہلی نظر پڑتے ہی زبان سے یہ دعا نکلی، اے اللہ! تو مجھے مستجاب الدعوات بنادے۔نہ جانے کتنی دیر میں خانۂ خدا کو اور خانۂ خدا مجھے دیکھتا رہا۔

اب ہمیں طواف کرنا تھا۔سامنے نظر ڈالی تو بیت اللہ کے گرد شمع توحید کے پروانے دیوانہ وار گردش کررہے تھے۔یہ وہ لوگ تھے جو پوری دنیا سے کھنچ کر اس مرکز پہ آئے تھے۔میں سوچ رہی تھی آخر کیا کشش ہے اس چوکور سی عمارت میں جو بظاہر ایک سادہ سی عمارت ہے مگر یہ کیسی کششِ شکل ہے جو دلوں کو بے ساختہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔دراصل یہ خدائے ذوالجلال کا کمال اور اس کی ازلی وابدی محبت ہے کہ بندہ دیوانے وار کھنچا چلا آتا ہے۔ایک ہی فقیرانہ لباس، ایک ہی طریقہ، ایک ہی مرکز اور ایک ہی والہانہ انداز اور پھر آگے بڑھ کر میں بھی انہی دیوانوں میں شامل ہوگئی۔لبیک اللھم لبیک۔طواف کرتے ہوئے اپنی درماندگی، کوتاہی، اعتراف گناہ کے ساتھ ندامت کا احساس دامن گیر رہا۔دعاؤں کے ورد کے ساتھ اشکِ ندامت بھی مسلسل بہتے رہے۔طواف کے بعد مقام ابراہیمؑ پر نماز شکرانہ ادا کرنی تھی۔شکر اس بات کا کہ خدا یہاں تک لایا اور یہ سعادت نصیب کی اور اس شکر کا اعادہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ خدا کی تعمیر کے بعد نفل پڑھ کر کیا تھا۔مگر شومئی قسمت کہ غیر معمولی رش کی وجہ سے حجر اسود کو بوسہ دینے ملتزم کو ہاتھ لگانے اور مقام ابراہیم پہ نماز کا موقع نہ مل سکا لہٰذا جہاں پر جگہ ملی نماز پڑھنے کھڑی ہوگئی۔مقام ابراہیم وہ جگہ ہے جہاں پر جو دعا مانگی جائے قبول ہوتی ہے۔دعا مانگتے ہوئے مجھے اپنے آپ کی کچھ خبر نہ تھی، خدا ہی جانتا ہے میں نے کیا مانگا اور کیا نہ مانگا جو مانگنا چاہیے تھا میں بس اپنے رحیم وکریم رب سے ہمکلام تھی، اس سے محوِ گفتگو تھی۔اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے معافی کی طلب گار تھی۔اے رب مجھے معاف کردے..... میرے اور سب کے

گناہوں کو اپنی رحمت سے معاف کر دے ..... میری اور سب کی مغفرت فرما دے .....اے اللہ تو نہ معاف کرے گا تو اور کون معاف کرے گا! تو پناہ نہ دے گا تو اور کون پناہ دے گا!

نہ جانے کتنا وقت گذر گیا اور کتنا گذر جاتا کہ پیچھے سے بھانجے نے آواز دی جسکا وہاں ساتھ ہو گیا تھا کہ اب اٹھئے بہت دیر ہو گئی، سجدے سے سر اٹھایا تو سامنے زم زم سے بھرا گلاس پایا جو شاید میرے بیٹے یا بھانجے نے رکھ دیا تھا مگر مجھے پتہ نہ چلا یوں لگا جیسے فرشتوں نے یہ گلاس بالخصوص میرے لئے بھرا ہو۔ پی کر طبیعت ٹھہری دل کو ایسا سکون ملا جیسے آبِ کوثر مل گیا ہو۔

پھر مزید زم زم سے سیر ہونے کے بعد سعی کا مرحلہ آیا۔ یہ مرحلہ طواف سے زیادہ جانگسل ہے میں پیدل تو نہ چل سکی میرے بیٹے نے وہیل چیئر پر اللہ اسے دہرا اجر دے اور میرے بھانجے کو بھی جو عمرہ کے دوران میرے ساتھ رہا۔ یہ ایک انتہائی تھکا دینے والا عمل ہے، بلندی پر چڑھنا اور پھر نشیب میں اترنا۔ حضرت ہاجرہ کی سنت جب ممتا کی ماری پانی کی تلاش میں ایک پہاڑی سے دوسری صفا اور مروہ کے چکر لگاتی رہیں۔ یہاں اسی زم زم کا پورے راستوں پر دورویہ انتظام ہے جو ممتا کی تڑپ کا قدرت کی طرف سے بہترین انعام اور رہتی دنیا تک ممتا کا ثبوت اور اس کی نشانی ہے۔ کیا ماں کی ممتا کا کوئی بدل ہو سکتا ہے ؟

دعاؤں کے ورد کے ساتھ میرا ذہن سوچ رہا تھا کہ حضرت ہاجرہؑ یہ کہنے کے باوجود کہ اللہ مجھے ضائع نہیں کرے گا کیوں نہ اللہ کو یاد کرنے بیٹھ گئیں، وہ اس کی تعریفوں اور حمد میں مصروف ہو جاتیں آخر کیوں انہوں نے یہ جانگسل مشقت، یہ بھاگ دوڑ کی۔ انہیں معلوم تھا کہ کسی چیز کے حصول کے لئے جدوجہد ضروری ہے اسی لئے انہوں نے انتھک کوشش کی تو پھر دین کا قیام تو زیادہ جدوجہد چاہتا ہے یہ بغیر سعی و کوشش کے کیسے قائم ہو سکتا ہے! مگر ہم اسکے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں کہ یہ از خود قائم ہو جائے گا یا اللہ چاہے گا تو قائم ہو جائے گا لیکن حضرت ہاجرہؑ عورت ہوتے ہوئے بھی اس بات سے اچھی طرح واقف تھیں۔ لہٰذا اللہ نے ہر عورت اور مرد پر اسے واجب کر دیا اور دین کے قیام کے لئے کوشش کا ہر ایک کو مکلّف بنا دیا۔ اس کو یہ سعی و کوشش اتنی پسند آئی کہ رہتی دنیا تک اس کو یادگار بنا کر حج اور عمرہ کا ایک رکن بنا دیا سبحان اللہ قربان جایئے اس ممتا کی بے پناہ تڑپ اور جدوجہد پر اور قربان جایئے اس رب مہربان پر جس نے اس ادا کو پسند کیا اور قبول فرمایا بلکہ انعام بھی عطا کیا۔ صفا و مروہ کو اپنی نشانی قرار دیا۔ یہ آیت پڑھتے ہوئے کہ صفا مروہ شعائر اللہ ہیں جو بہت خوبصورت انداز میں چھت کے چاروں طرف سنہرے حروف سے لکھی ہوئی ہے میرا ذہن اس وقت کے حالات اور پہاڑی کی اس اصل شکل پر غور کر رہا تھا جو آج سے یکسر مختلف تھی اس وقت کی یہ سعی کتنی جانگاہ ہو گی جب صفا و مروہ پہاڑ پر چڑھنا ہوتا تھا۔ آج تو یہ محض راستہ ہے اور انتہائی آرام دہ صرف بلندی اور نشیب کا فرق باقی ہے۔ اور پہاڑ کا تھوڑا سا حصہ جو نشانی کے طور پر شیشے میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اصل سعی تو وہ تھی اصل اجر تو پہلے کے لوگ لوٹ لے گئے۔ اصل اجر کی حقدار تو حضرت ہاجرہؑ ہیں جن سے اللہ راضی ہوا۔ حضرت ابراہیم جنہوں نے کعبتہ اللہ کی تعمیر کی اور حضرت ہاجرہؑ جنہوں نے سعی کی تکمیل کی دونوں اللہ کے پسندیدہ اور محبوب ہوئے۔ ابراہیمؑ خلیل اللہ ٹھہرے اور ہاجرہؑ کی سعی شعائر اللہ بنی۔ کیا ہی خوب ہیں یہ اللہ کے بندے کہ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی .....سعی کے بعد عمرہ مکمل ہوا شکر اس خدا کا جس نے اس کی توفیق دی اور تکمیل کرائی۔ ظہر کی نماز مہمان خانے میں ادا کی پھر اپنے ٹھکانے پر واپس آئے۔ اس دن یہاں قیام کے بعد اب ہماری اگلی منزل مدینہ تھی جس کا حسین تصور بچپن سے ذہن پر نقش تھا بچپن میں پڑھی ہوئی نعت کا یہ مصرع ذہن میں گونج رہا تھا

دکھا دے یا الٰہی وہ مدینہ کیسی بستی ہے
جہاں پر رات دن مولا تری رحمت برستی ہے

وہ مدینہ جو مسلمانوں کا حسین محور و مرکز اور جس سے ہر مسلمان کا قلبی تعلق ہے۔ ہم گیارہویں دن بس کے ذریعہ مدینہ روانہ ہوئے

اپنی ہی لکھی ہوئی نعت کے اشعار لب پہ آ رہے تھے

دکھا دے الٰہی دیارِ مدینہ میسر ہو مجھ کو بہار مدینہ
ہو رستہ بھی آساں سفر دلنشیں ہو کہ فرحت چلی ہے دیارِ مدینہ

سو اللہ نے دیارِ حبیب بھی دکھا دیا اور اس کے ماحول سے لطف اندوز بھی کیا، سو بار شکر اللہ کا۔ مدینے کا سفر طویل مگر خوشگوار تھا۔ دل کو طمانیت اور خوشی حاصل ہو رہی تھی مگر دماغ اس دور کے حالات پہ غور میں مصروف تھا جب رسولِ خدا ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ناخوشگوار حالات، راستہ پر خطر، ہر لمحہ جان کا خطرہ، پورا راستہ پہاڑی اور ریگستانی، فاصلہ اتنا طویل..... کہ رسول اللہ نے ان راستوں پر سفر کیا۔ مگر عظیم تھا وہ سفر جو خدا کے راستے پر، خدا کی خاطر، خدا کے اس عظیم بندے نے کیا۔ آج تو ہر جگہ آسانیاں ہیں چوکیاں بنی ہوئی ہیں، پانی کا انتظام ہے۔ ہوٹل ہیں، مسجدیں ہیں، ٹھہرنے کے لئے قیام گاہیں ہیں۔

انہی خیالات و تصورات کے ساتھ یہ سفر تمام ہوا۔ ہم اپنی قیام گاہ پر اترے۔ ہوٹل کے سامنے مسجد نبوی کا بلند مینار دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ دل جذبات سے لبریز ہو گیا۔ یہ وہی شہر تو ہے جو آپ کی آمد سے شہر مدینہ بن گیا۔ جہاں آپ نے قدم رنجہ فرمایا، جہاں آپ قیام پذیر ہوئے اپنی زندگی کے دس قیمتی سال گذارے۔ جہاں جنگ بدر، جنگ احد کا معرکہ ہوا، غزوہ خندق برپا ہوئی جہاں آپ کی آخری و ابدی آرام گاہ ہے۔ یہ سرزمین ہی مقدس نہیں اس کی تو مٹی بھی سرمۂ نگاہ ہے۔

دل تو فوراً روضۂ نبی پر جانے کو مچل رہا تھا لیکن بہ وجوہ فوراً جانا نہ ہو سکا۔ عشاء کے وقت جب ہم وہاں پہنچے تو بے انتہا رش تھا یہاں مردوں اور عورتوں کا حصہ بالکل الگ ہے بے انتہا رش کی وجہ سے ہمیں ریاض الجنہ تک جانے میں تقریباً گھنٹہ لگ گیا کیونکہ چل نہیں بلکہ سرک رہے تھے۔ روضہ تو بالکل نظر نہیں آ رہا تھا وہاں تک پہنچ کر محبوبِ خدا کو اپنا اور سب کا سلام پیش کیا اور ریاض الجنہ پر دو رکعت نفل پڑھے۔ درود و سلام بھیجتے ہوئے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ زبان محو گفتگو تھی، یا رسول اللہ! اس عاصی و گناہ گار کی اپنے درِ اقدس پر حاضری قبول فرما لیجئے۔ آپ کا دامن رحمت اور روز محشر آپ کی شفاعت نصیب ہو جائے۔ آپ عالی مقام ہیں یہ مرتبہ آپ ہی کو زیبا ہے۔ یا رسول اللہ آپ اپنے حصے کا کام کر کے دنیا کو سچائی کا راستہ دکھا گئے۔ مگر آپ کی امت آج بھی ہدایت سے بے بہرہ ہے، گمراہی میں بھٹک رہی ہے، دین کو رسوا کر رہی ہے۔ ہم شرمندہ ہیں آپ سے، ہم آپ کے لائے ہوئے دین کی حفاظت نہ کر سکے۔ آپ کی سنت کو قائم نہ کر سکے۔ دل بے قرار تھا۔

بڑی مشکل سے طبیعت پر قابو پایا پھر اندرونی حصے کی طرف آئے۔ سبحان اللہ! کیا سماں تھا، جدھر نظر ڈالیں حسنِ تعمیر کا بہترین نمونہ منقش چھتیں اس پر کندہ قرآنی آیتیں چمکتے ستون حسین محرابیں، سنہری جالیاں۔ جن لوگوں نے اسے تعمیر کیا یہ انکا کمال تو ہے لیکن اصل کمال اس کا ہے جس نے اپنے درِ محبوب کو یہ جمال بخشا، یہ رونق اور خوشنمائی عطا کی، ہر چیز میں وہ حسن و جمال جسے زبان بیان کرنے اور قلم لکھنے سے قاصر ہے مکہ کے ماحول میں خشیت اور جلال ہے لیکن مدینے میں جمال ہی جمال، نرمی اور حسنِ سلوک کا بہترین نمونہ۔ اندرونی حصہ بہت وسیع ہے اسے طے کرتے ہوئے دل کہہ رہا تھا یقیناً یہ سب کچھ آپ کے مرتبے کے شایان شان ہے یہ تو دنیا کا انعام ہے آخرت کا انعام یقیناً اس سے بہت زیادہ ہوگا۔ یہاں درِ محبوب پر ہر وقت لاکھوں لوگوں کی حاضری اور رفعنا لک ذکرک کا وہ بہترین انعام جس کا ثبوت مسجد کے در و بام میں گونجتی ہوئی پانچوں وقت کی اذانیں اور نماز میں کیجانے والی قرأت جو دلوں کو گداز کرتی ہے۔

اب ہم مسجد کے پچھلے حصے کی طرف آئے وہ جگہ دیکھی جہاں روضۂ رسول اور حجرہ رسول ہے، یہی آپ کی آرام گاہ اور قریب ہی حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ آرام فرما رہے ہیں۔ وہ کھڑکی دیکھی جو پہلے دروازہ تھا، یہاں سے حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آیا کرتے تھے۔ سامنے سبز گنبد تھا جسے گنبد خضرا بھی کہا جاتا ہے بے ساختہ زبان پر سلام جاری ہو گیا۔

باہر وسیع و عریض صحن میں لگی ہوئی چھتریاں جو خوبصورت ستونوں کے ساتھ دور تک پھیلی ہوئی ہیں انتہائی خوبصورت منظر پیش کرتی ہیں۔ بنانے والے کے اس نادر خیال پر دل عش عش کر اٹھا۔ یہ ماحول کا حسن دوبالا کرنے کے ساتھ دھوپ کی تمازت اور سردیوں میں ٹھنڈ سے بچاتی

ہیں۔ میرا ذہن پھر پچھلے دور کی طرف مڑ گیا۔ ابتدا میں یہ مسجد جس کی بنیاد خود رسول اللہ ﷺ نے رکھی تھی، کھجور کے تنے سے بنائے گئے ستونوں پر اوپر کھجور کے پتے اور مٹی ڈال کر بنائی گئی چھت پر مشتمل تھی۔ نیچے تپتی ہوئی ریت کا فرش جس پر سجدہ کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ کی پیشانیوں پر آبلے پڑ جاتے تھے۔ مگر آج یہ دنیا کی سب سے بڑی اور حسین ترین مسجد ہے۔ کیا ہی خوبصورت ہے یہ انعام جو آپ کو دین الٰہی کے قیام کے لئے مساعیٔ جلیلہ کے صلے میں اللہ نے عطا کیا ہے۔ میں نے زیادہ تر نمازیں صحنِ مسجد میں ادا کیں اور وہیں دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھی ہوتی سامنے روضۂ رسولؐ ہوتا، اوپر تاحدِ نظر پھیلی ہوئی چھتریا، روشنی میں نہائے ہوئے بلند و بالا میناران میناروں کو دیکھ کر مجھے تھوڑے دنوں پہلے کہے ہوئے پوپ کے الفاظ یاد آئے کہ مسجدوں میں اتنے بلند مینار نہ بنائے جائیں۔ شاید اس سے ان کے دل دہلتے ہونگے۔ میں انہیں دیکھتی رہتی اور دل سے دعا نکلتی، میرے اللہ! تو ان میناروں اور اس کے در و بام کی حفاظت کرنا کہ دشمن اس کو مٹانے کے درپے ہیں۔

مدینے میں آٹھ دن کا قیام پلک جھپکتے گذر گیا۔ مسجد نبوی میں آخری نماز عشاء کی تھی۔ واپسی کے، خیال سے دل بہت اداس تھا۔ بوجھل طبیعت اور چشم پرنم کے ساتھ ان مناظر کو خیر باد کہا جنہیں دل چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ مسجد سے نکلتے ہوئے بار بار پلٹ کر دیکھتی رہی۔ پتہ نہیں اب کب انہیں دیکھوں۔ دیکھ سکوں یا نہیں، دوبارہ آسکوں یا نہیں! دل بے انتہا افسردہ تھا۔ ہم سے رات کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ رات کے گیارہ بجے ہم اس مقدس سرزمین سے رخصت ہو کر ائیر پورٹ پہنچے جہاں سے ہمیں پھر دوبئ سے ہو کر کراچی واپس آنا تھا اور یوں ہمارا یہ مبارک محترم اور یادگار سفر تمام ہوا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ہاتھ اور دُعا

بچہ درد سے تڑپ رہا ہو اور دوا میسر نہ ہو تو والدین کی آنکھوں سے آنسو نہیں آگ برستی ہے

دل کا درد کتنا تڑپاتا ہے، یہ ہر دردمند دل رکھنے والا نہیں جان سکتا بس صرف جو اس درد کی سرحد سے گزرا ہوتا ہے وہی اس سفر کی اذیت اور تھکان کی شدت بیان کر سکتا ہے۔ یا پھر وہ والدین جن کے بچوں کو یہ موذی مرض اپنی گرفت میں لے لیتا ہے مگر مریض بچے سے زیادہ اس ماں کا دل وہ تکلیف محسوس کرتا ہے جس ماں کے پاس دل کا سوراخ بند کرنے والے مسیحا کو دینے کے لئے نوٹوں کا ڈھیر نہیں ہوتا۔

وہ قوم کے خدمت گار اور زندگی بچانے کا دعویٰ کرنے والے اپنے دلوں میں پتھروں سے زیادہ سختی رکھتے ہیں جنہیں ان بچوں کی تڑپ اور والدین کے آنسو بھی نہیں پگھلاتے جو اپنی زندگی کو بیچ کر اپنے جگر گوشوں کی جان بچانے کی سعی کرتے ہیں۔ جانے وہ کس تاریخ کا اخبار تھا جس میں اندرون سندھ میں رہنے والے شاہ زیب اور رانی کی اذیتوں کی کہانی تھی جسے پڑھ کر شاید ہی کوئی صاحب اولاد ایسا ہو جس نے ان کے دل کا درد اپنے دل میں محسوس نہ کیا ہو۔ اخبار میں ذکر تو صرف ایک ہی شاہ زیب اور رانی کا تھا مگر ایسے سینکڑوں بچے ہمارے ملک میں سسک سسک کر مر رہے ہیں جنہیں علاج کی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں۔

اس غریب ملک کے خوشحال عوام سے وہ بچے سوال کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہم نے اس ملک میں پیدا ہو کر کونسا جرم کیا ہے کہ بھوک، مفلسی، بیماری اور محتاجی میں کوئی صاحب دل صاحب حیثیت آگے بڑھ کر ہمارے آنسو اور ہمارے والدین کی آہیں روکنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا علاج کے لئے ڈھیروں روپیہ نہ ہونے کے سبب وہ ننھے ننھے ہاتھ اپنے والدین کے مجبور ہاتھوں سے چھوٹ جاتے ہیں اور پھر بے بسی اور دکھ کی کیفیت میں ان ہاتھوں کو اٹھانے والے کیا دعا مانگیں گے؟

مجبور والدین کے لئے بیماری سے تڑپتے ہوئے بچے کو دیکھنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے اس سوال کا جواب وہ بچے جانتے ہیں جو درد کی ہر لہر کے ساتھ زندگی سے دور ہو رہے ہیں۔ وہ چاند جو آنگن میں روشنی بکھیرنے آتے ہیں ماند پڑنے لگتے ہیں۔

اور وہ پھول مرجھانے لگتے ہیں جن کی خوشبو سے ماں کی گود مہکتی ہے اور پھر جب تکلیف کی شدت ناقابل برداشت ہوتی ہے نبض ڈوبنے لگتی ہیں اور دل کی رفتار سست پڑتے پڑتے رک جاتی ہے تو ماں کی آنکھیں بھی بے نور ہو جاتی ہیں۔ جس سینے پر سر رکھ کر وہ بچہ سوتا تھا اس میں کہرام برپا ہو جاتا ہے اور اس ماں کا دل درد کا گھنا جنگل بن جاتا ہے جہاں صرف کانٹے اگتے ہیں۔

ایسے بچوں کو بچانے کے لئے کرنا کیا ہوتا ہے کہ دل کا کوئی سرجن انکا سینہ کھول کر دل کا وہ سوراخ بند کر دے جس میں درد اٹھتا ہے مگر بدنصیبی سے وہ سرجن بہت مہنگے ہیں اور فی سبیل اللہ زندگی نہیں بچاتے انہیں فیس چاہیے جن سے وہ اپنے بچوں کے لئے زندگی کی خوشیاں اور آسائشیں خرید سکیں۔ مگر تکلیف تو کسی کا بھی نصیب ہو سکتی ہے بیماری تو کسی کا گھر بھی دیکھ سکتی ہے موت کے آہنی پنجے تو کسی کو بھی اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں تو کیا ان مسیحاؤں کی اولادیں اس دنیا کی مخلوق نہیں ہیں؟ بچھڑنے کا دکھ تو ایک ہی ہوتا ہے مگر لمحہ لمحہ موت اور آہستہ آہستہ بچھڑنا ہر روز نیا دکھ تخلیق کرتا ہے اور اس دکھ کا آشیانہ بے بس اور مجبور والدین کا دل ہوتا ہے۔

ان ساری اذیتوں کے پس منظر میں ایک خواب بھی تخلیق کرتی ہوں کہ پاکستان میں بچوں کا علاج مفت ہو رہا ہے ہیموفیلیا، تھیلیسیمیا،

ہیپا ٹائٹس، کینسر جیسے موذی مرض کی زندگی بچانے والی ادویات ہر میڈیکل سٹور پر موجود ہیں اور بچوں کے علاج کے لئے اس دوا کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ سرجن ڈاکٹر اس ملک کے مستقبل کو بچانے کی خاطر آپریشن کی فیس نہیں لیتے ہسپتال میں بہترین سہولتیں میسر ہیں اور جسم کا گلا سڑا عضو کاٹنے کی بھی کوئی قیمت نہیں لی جا رہی اور بچوں کی نازک ہڈیاں جوڑنے کے لئے کسی کی جیب نہیں کاٹی جا رہی۔

کاش میرا یہ خواب سچ ہو جائے اور میرے ملک کے پھول مہکتے رہیں، چاند روشن رہیں اور والدین کے اٹھے ہوئے ہاتھ ان مسیحاؤں کے لئے دعائیں مانگیں جو ان کے بچے کی زندگی بچانے کا وسیلہ بنتے ہیں۔

بچہ درد سے تڑپ رہا ہو اور دوا میسر نہ ہو تو والدین کی آنکھوں سے آنسو نہیں آگ برستی ہے، ایسی آگ جو سب کی خوشیاں جلا سکتی ہے۔ خدارا اس آگ سے بچنے کے لئے اپنی صلاحیتوں اور شفایابی کی طاقت کی ٹھنڈک استعمال کریں، ان بچوں کے لئے جو درد کی شدت سے تڑپ رہے ہیں۔

محشرِ خیال

عشرت لطافت ۔کراچی

''بتول'' میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔گو کہ میں اس کی بہت پرانی قاری نہیں لیکن اب تو ''اسکا ہر ماہ بے چینی سے انتظار رہتا ہے، اس کے تمام سلسلے اور مضامین کا الگ الگ انداز دل کو بھاتا ہے ۔ قانتہ رابعہ اور ڈاکٹر نزہت اکرام کی تحریریں دل کو چھو لیتی ہیں جون 2011ء میں قانتہ رابعہ کی تحریر ''میری لائبریری سے'' پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ حمیرا مودودی صاحبہ کی کتاب ''ہمارے والدین شجر ہائے سایہ دار'' میں کافی عرصہ ہوا پڑھ چکی تھی۔تحریر میں سادگی،نفسِ مضمون ہماری روایات و اقدار اور اللہ کی ذات پر کامل یقین سے بھرپور نظر آتا ہے ۔ایسی ہستیوں کی زندگی ہم سب کے لئے نمونہ ہے مئی میں سعدیٰ مقصود کا لکھا ہوا افسانہ'' آئیڈیل'' بھی خوب تھا اور ہماری سوچ کے قریب کہیں کہیں تو آنکھیں نم ہو گئیں واقعی ماں کا دل ایک سمندر ہوتا ہے اور وہ ایک آئیڈیل ہی ہو سکتی ہے۔

تیمیہ صبیحہ۔راولپنڈی

مینا خالہ کی یاد میں بتول کا شمارہ آپ نے بہت جلد مرتب کر ڈالا۔اس پھرتی پر یقیناً مبارکباد دینا چاہیے۔ پڑھتے ہوئے مسلسل انکا مسکراتا ہوا شفیق چہرہ نگاہوں میں گھومتا رہا۔خود پسِ پردہ رہ کر حوصلہ افزائی کرنا ،نوجوانوں کو آگے بڑھنے کے مواقع دینا، اپنا قد اتنا نہ دکھانا کہ نوخیز کلیاں ، پھول حوصلہ ہار جائیں یہ ایک بڑی خوبی ہے۔ صرف تحریک اور ادب میں ہی نہیں ، بلکہ پیشہ ورانہ زندگی میں بھی اداروں کو تازہ خون کی فراہمی کے لئے ضروری ہے۔ بہت سی دیگر بہنوں کی طرح میرا ذاتی تجربہ بھی ہے۔حریم ادب کے آغاز میں ، جب یہ محفل اسماء مودودی صاحبہ کے ہاں ہوا کرتی تھی، میں اور عینیہ امی کے ہمراہ شریک تھیں ۔دونوں نے بچوں کے انداز میں ناپختہ سی نظمیں سنائیں ''اے وطن کے نونہالو!'' اور ''میرا بھیا'' ردیف، قافیہ اور نفسِ مضمون تو یاد نہیں البتہ آپا جی بنت الاسلام صاحبہ کی حوصلہ افزا مسکراہٹ اور مینا خالہ کا گود میں بٹھا کر پیار کرنا یاد ہے ۔عینیہ پر تو خصوصاً شفقت ہوئی کہ اسے اپنے پرس سے ایک کڑھائی کیا ہوا استری شدہ رومال انعام میں دیا، جو وہ اب تک سنبھالے ہے اور جہیز میں اپنے گھر تک لے گئی ہے۔

اس کے بعد بھی کبھی بچوں کے لئے امی کی لکھی ہوئی کسی کہانی کو کھڑا ہو کے سنایا تو یوں داد ملتی گویا یہ ہماری تصنیف ہے ۔حریم ادب کی ان محفلوں میں شرکت کا شوق مینا خالہ کی مسکراہٹ اور حمیرا مودودی صاحبہ کے بنائے رشین سلاد کھانے کی خواہش سے فزوں ہو جاتا تھا ۔تب میری عمر تقریباً دس سال کی تھی ۔اس محفل کے ''بیت احسن'' منتقل ہو جانے کے بعد جب شرکت ہوئی اور میں نے اپنے لکھے ناپختہ طویل افسانے /ناولٹ سنائے (جنہیں میں خود دوبارہ پڑھنے سے اکتا جاتی ہوں) تو ان کے انداز نے کبھی یہ ظاہر نہ کیا کہ میں شرکا محفل کا کتنا وقت ضائع کر چکی ہوں ۔ بہت نرم لہجے میں لیکن بڑا پختہ اور فنکارانہ تبصرہ جو مایوس نہیں کرتا تھا، بلکہ اصلاح پر آمادہ کرتا تھا۔

مرکز خواتین میں بھی ان کی جھلک ایسی ہی تھی ۔چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ ۔ملنے پر کبھی احساس نہ ہوا کہ وہ کتنی بڑی ہیں، کیسی اہم اور مصروف ذمہ داری پر ہیں.....ہم بچیوں کو بھی ایسی ہی اہمیت ملتی جیسی تحریکی ذمہ دار خواتین کو.....اخلاص، محبت اور دلسوزی کے ذریعے جو

تربیت اور کردار میں پختگی پیدا ہوتی ہے ، وہ شاید ہیومن ریسورس مینجمنٹ کی ورکشاپوں سے بھی نہیں ہوتی ۔اللہ تعالیٰ ان پر رحمتیں نازل کرے آمین اب تقریریں اور کاغذی طومار تو بہت ہیں عملی نمونے کم کم نظر آتے ہیں ۔شائستگی ،سلیقہ ،صفائی ،نظم وضبط یا ہوم مینجمنٹ کہہ لیں اس پر مستزاد ۔آپا حمیدہ بیگم کی مینا خالہ کو شادی کے بعد کی گئی نصیحت بہت اہم محسوس ہوئی اب تو ہمیں کئی محاذوں پر متحرک ہونا پڑتا ہے ، اس لئے اپنے اصل میدان یعنی گھر میں خود کو نامکمل اور غیر متوازن ہونے سے بچانا ضروری ہے ۔ پہلے میں لفافے ہی تہہ کر کے رکھ رہی تھی (نیر بانو صاحبہ کی عادت پڑھ کے) اب ٹیڑھی بھینگی چیزوں کو سیدھا کرتے رات ہو جاتی ہے ۔(''چارپائی'' بھی ٹیڑھی ہو تو سر درد ہو جاتا ہے'' کی روایت پڑھنے کے بعد) مگر ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں شائع ہونا چاہیں تاکہ زندگی سنوارنے کے لئے عملی نمونے مل سکیں ۔ رسالے میں کسی کسی جگہ کچھ تشنگی محسوس ہوئی مثلاً صحافتی طرز پر ان کا شخصی تعارف ، پیدائش ، آبائی مسکن ،تعلیم ، بیاہ وغیرہ ۔شاعری کے علاوہ ان کے خطوط ،نثر ، ادارت وغیرہ کا انتخاب دیا جا سکتا تھا ۔کوئی تقریر یا خطاب اگر ریکارڈ ہو تو اس طرح خاص نمبر ایک تاریخی دستاویز بن جاتا ہے یہ چند باتیں یاد آ گئیں اور لکھی گئیں ورنہ تبصرہ تو ہر شمارے پر کرنے کا دل چاہتا ہے ۔

شازیہ مسلم ۔لاہور

اللہ تعالیٰ سے آپ کی ادبی کاوشوں کو مزید بڑھانے اور ان میں برکت عطا کرنے کی ڈھیروں دعائیں ہیں ۔آمین

ماشاءاللہ بتول کی پوری ٹیم ہی لائق تحسین ہے کہ جو اس نفسانفسی کے دور میں بھی نہایت ہی مناسب قیمت میں اصلاحی ادب کو گھروں کی زینت بنائے ہوئے ہے ۔ بتول کا ایک ایک افسانہ ، اداریہ اور مختلف عنوانات کے تحت لکھے جانے والے کالم ہمیشہ ہی دلچسپ اور سبق آموز رہے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن تو نہیں مگر لڑکپن سے لیکر اب تک یہ ہماری دلچسپی اور سیکھنے کا سامان کیے ہوئے ہے ۔ اتنے بھاری بھرکم اور ادیب افراد کے درمیان اپنی ایک چھوٹی سی تحریر دیکھ کر اور پہلی دفعہ بتول میں اپنا نام دیکھ کر ایسی خوشگوار حیرت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے ، میرے جیسی ناچیز کو جو اپنی دانست میں قلم پکڑنے کا ڈھنگ بھی نہیں جانتی اس کی تحریر بتول میں چھاپ کر آپ نے مجھے ایک حوصلہ اور اعتماد دیا ہے ۔اب تو واقعی بتول کے لئے کچھ نہ کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ ہر ماہ اپنی ہوش سے لیکر اب تک جو خیالات اور تاثرات بتول پڑھنے کے بعد دماغ اور دل میں اٹھتے تھے آج صفحہ قرطاس پر اتارنے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے ۔شکریہ میرے عزیز بتول اور میرے بتول کی ٹیم !اللہ تعالیٰ آپ سب کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور ان کاوشوں کو دنیا اور آخرت میں سربلندی کا باعث بنائے آمین ۔

☆ بہن ! اللہ آپ کو جزائے خیر دے ۔ شاعری ، شعری پیمانوں کے مطابق نہیں ہے ۔ آپ نثر میں اچھا اظہار خیال کر سکتی ہیں ۔

حفصہ افضال ۔گجرات

بنتِ مجتبیٰ مینا..... جو میرے لئے فقط ''بتول'' کی مدیرہ تھیں اس سے زیادہ میں انہیں کسی حوالے سے نہیں جانتی تھی ۔ بتول کی مدیرہ کا حوالہ میرے لئے ان کی پہچان بنا اور بتول بھی تو ابھی فقط تین ، چار ماہ سے ہی باقاعدگی سے آنا شروع ہوا تھا ۔لیکن کبھی بھی پورے بتول کا مطالعہ نہیں کیا ۔ ہمیشہ کچھ تحریریں چھوٹ ہی جاتی ہیں جن پہ بس اک نظر ڈال لیتی ہوں ۔ مصروف تعلیمی روز و شب باقاعدگی سے کسی رسالے کا مطالعہ کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتے لیکن پھر بھی مجھے ہر ماہنامے کا شدت سے انتظار ہوتا ہے ۔

بنتِ مجتبیٰ مینا کے وصال کی خبر مجھے جولائی کا شمارہ دیکھ کر ہوئی ، سرورق پہ جگمگاتی dedication ''بنت مجتبیٰ مینا کی یاد میں'' نے دلہن کی رخصتی کی خبر دی ۔اور یہ کیسی رخصتی تھی جس نے خوشیوں کے پیام کی بجائے نوحوں کا سندیسہ دیا اور یہ بتول کا پہلا اور اب تک کا واحد شمارہ

تھا جسے میں نے الف سے یے تک پڑھا اور اس کی ہر ہر سطر پڑھنے سے بنتِ مجتبیٰ مینا کی پاکیزہ سیرت پرت در پرت کھلتی چلی گئی میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا لیکن پھر بھی میں کہوں گی کہ وہ چودھویں رات کی دودھیا کرن کی مانند تھیں میں نے اُن سے کبھی گفتگو نہیں کی لیکن میں پھر بھی کہوں گی کہ ان کی گفتگو میں پھولوں سی نازکی اور شہد سی شیرینی تھی۔ میں نے اُن سے کبھی ملاقات نہیں کی لیکن میں پھر بھی کہوں گی کہ وہ ماہِ تاباں تھیں۔ میرا جماعت سے کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ جماعت اُنکے ساتھ پہ نازاں رہی۔ وہ میری سہیلی نہیں تھیں لیکن تخیل پوری شدت سے کہتا ہے کہ وہ سیپ جیسی بہترین رازداں تھیں۔ وہ میری ماں نہیں تھی لیکن میں اُنکی بیٹیوں کی لکھی تحریروں کی ہر ہر سطر کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ وہ شجر سایہ دار تھیں۔

اُنہوں نے سعادت کی زندگی گزاری..... ایک ایسی زندگی جس کی ہر ذی شعور آرزو کرتا ہے۔

گو ان کی شاعری کا ہر اک شعر اپنی مثال آپ ہے یوں محسوس ہوتا ہے گویا الفاظ اُنکے نوک قلم سے تحریر ہونے پہ خود پہ نازاں رہے لیکن ان چند اشعار نے سیدھا میرے دل پہ اثر کیا۔

؎ مرثیہ دلی مرحوم کا لکھا تھا کبھی
مرثیہ ڈھاکہ و جیسور کا اب کہنا ہے
تو نے کیا کیا نہ سہا سیل بلا کے ہاتھوں
تجھ کو کیا کیا دل ناشاد ابھی سہنا ہے

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم نے ان کی رخصتی کا جو نقشہ کھینچا اُس نے حقیقی معنوں میں آبدیدہ کر دیا اور ہم نے شبنمی آنسوؤں سے اُس پاکیزہ روح کی عظمت کو سلام پیش کیا جو اپنی ذات میں انجمن تھیں۔

چمنِ بتول کا سب سے خوبصورت گلاب مرجھا گیا لیکن یہ کیسا گلاب ہے جو خود تو فنا ہو گیا لیکن اپنی خوشبو پیچھے چھوڑ گیا..... عطر سے زیادہ مسحور کن خوشبو..... جو ہمیشہ چمنِ بتول کو مہکائے گی۔

؎ ایک خوشبو فضا میں ہے رقصاں
اور گل کا پتہ نہیں ملتا

اور مریم نے کتنا سچ کہا..... ''بنتِ مجتبیٰ مینا'' اس کی صرف ''نانو'' تھیں..... کیسا فخر تھا اُس کے ان الفاظ میں..... واقعتاً اُس کے فخر کرنے کو صرف یہی کافی ہے۔

مجھے مریم پہ رشک آیا، بے تحاشا رشک۔ کاش یہی جملے میں بھی اُنکے بارے میں کہہ سکتی۔ یا کاش میں کبھی اُن سے ملی ہوتی..... ماضی کے پردے پہ فقط اک ملاقات ہی نقش ہوتی..... یا کبھی اُن سے گفتگو ہی کی ہوتی..... ساعتیں دعویٰ تو کر سکتیں کہ انہوں نے بھی کبھی وہ حلاوت بھری آواز سنی تھی یا پھر کبھی اُن سے قلمی رابطہ ہی ہوا ہوتا بصارت کہہ تو سکتی کہ اس گوہرِ تاب دار نے کبھی اُسے بھی تراوٹ بخشی تھی.....

ایسا کچھ نہیں ہوا..... افسوس..... پھر یہ ایسی کیا چیز ہے جو اُن کے بارے میں مجھ سے لکھوا رہی ہے کہ

؎ ایسے گئے کہ زندگی کی شام ہو گئی
لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے گزری سحر کو میں

☆☆☆

بتول میگزین

وہ قریب ہے!

(عظمیٰ صدیقی۔کراچی)

آج اپنی ڈائری کا سرسری سا مطالعہ کیا تو کچھ احساسات لکھے ہوئے پائے دل چاہا کہ آپ سب کو بھی اپنے اُس امتحان کے احوال میں شریک کروں جس سے گزرنے کے مراحل اور لمحہ لمحہ ٹوٹتی امید کو اپنے رب سے جوڑنے سے میں نے بہت کچھ پایا۔شاید میرے اس تجربے کو پڑھ کر آپ کو بھی اپنی زندگی کا کوئی گذرا لمحہ یاد آجائے جس میں رب کائنات نے آپ کو بہت کچھ نوازا ہو۔میری پیاری امی کافی عرصے سے مختلف بیماریوں میں گھری ہوئی تھیں اور صورتحال یہ تھی کہ مختلف جگہوں سے علاج پر چند دن افاقہ اور پھر شدت میں اضافہ.....کہ ایک رات بھائی بہت پریشانی میں آیا اور امی کی بگڑتی حالت کے بارے میں بتایا۔ہم ایمرجنسی میں قریبی نجی ہسپتال لے کر گئے لیکن اتوار کا دن اور پھر رات بارہ بجے کا وقت کوئی قابل ڈاکٹر نہ ہونے کی وجہ سے درد کے انجکشن لگوا کر گھر لے آئے۔رات تین بجے حالت بگڑنے کی صورت میں ایمبولینس میں ڈال کر دوسرے ہسپتال لے گئے چند ابتدائی ٹیسٹوں سے واضح ہوا کہ حالت نازک ہوگئی ہے۔کچھ دنوں سے اس ہسپتال کی شہرت کافی خراب ہو چکی تھی۔اکثر لوگ ناقص کارکردگی کی شکایت کرتے تھے۔سو، وضو کیا صلوٰۃ الحاجات پڑھی تو ایک اور ہسپتال کی طرف دھیان گیا۔وہاں لے کر پہنچے تو امی کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور C.C.U میں ایڈمٹ کر دیا گیا، پھر ٹیسٹوں کی یلغار، جسم کے تمام نظاموں کا ایک کے بعد ایک خراب ہوتے جانا، ڈاکٹروں کی خاموشی جیسے ہمارے دلوں کو مٹھی میں لئے ہوئی تھی، سب بہنوں اور بھائیوں کی نظریں مجھ پر اور میری اللہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں، ادھر ڈاکٹر ہر دو سے چھ گھنٹے بعد ایک ٹیسٹ کا اعلان کرتے۔ادھر بھائی دوڑ لگاتے ان کی خواہش پوری کرنے کے لئے اور میں مصلیٰ بچھا کر اپنے رب سے سب کچھ ٹھیک ہو جانے کی التجائیں کرنے لگتی ان بائیس دنوں میں ڈاکٹروں کے چہرے کی مایوسی، بہنوں بھائیوں کے چہروں کی اداسی اور امی کی آنکھوں میں سینکڑوں سوالات اور ان میں تیزی سے پھیلتی ہوئی پیلاہٹ نے میرے دل میں نا اُمیدی کی رمق پیدا نہ ہونے دی، اس میں یقیناً کمال میرے پیارے رب کریم کے محبوب اور ہم گناہ گاروں کے سرکار محمد ﷺ کا بتایا ہوا طریقۂ کار صلوٰۃ الحاجت کے ذریعے سے اللہ سے مدد مانگنا تھا۔جس دن پہلی دفعہ گھر سے اٹھا کر رات بارہ بجے قریبی ہسپتال لے کر گئے تھے اور اس کے بعد کے بھی تمام مراحل حتیٰ کہ ایک ہسپتال سے نا امیدی اور دوسری جگہ ایک فرشتہ صفت ڈاکٹر کا ملنا اور پھر پتے کے آپریشن کے بعد امی کا صحت کی طرف تیزی سے آنا ''الحمدللہ'' ان سب کے دوران صلوٰۃ الحاجات سے میں نے اپنے آپ کو جوڑے رکھا یا یوں کہیے کہ اپنے رب سے جڑنے کا بہترین ذریعہ جو یقیناً کافی سالوں سے معلوم تھا، مگر بہت دفعہ ہم بہت کچھ پڑھ کر بھی انجان بنے رہتے ہیں اور اس پر عمل نہیں کر پاتے، لیکن اُس امتحان کے بعد سے آج تک میں دوستوں، احباب میں ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی آیت کے مفہوم کو ضرور دہراتی ہوں اور اپنے ایمان کو تازہ کرتی ہوں کہ ''میں انسان کی شہہ رگ سے بھی قریب تر ہوں'' اور یہ کہ ''جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو اے نبیؐ! آپ انہیں بتا دیں کہ میں ان کے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو اس کا جواب دیتا ہوں۔''

تربیت کیسے کریں؟

(نجم السحر ۔سیالکوٹ)

بچوں کی تربیت کرنے کے ضمن میں اکثر والدین یہ شکایت کرتے ہیں کہ ''کیا کریں بچے سنتے نہیں'' رسولؐ خدا کی زندگی اور صحابہؓ کی زندگیاں دیکھیں، انبیاء کی اور شہداء کی زندگیاں دیکھیں۔ان میں سے کوئی بھی اپنی اولاد کے گھٹنے سے لگ کر نہیں بیٹھا اور نہ ہر وقت کی ٹوکا ٹاکی کی، البتہ اپنے عمل کو ضرور نمونہ بنایا راعی ہونے کا احساس رکھیں۔ یقیناً ہم کسی چرواہے سے اور ہماری اولاد بکریوں کے ریوڑ سے بہتر حالت میں ہیں۔لیکن یہاں ایک واقعہ نقل کرنا ضروری ہے۔ اُمید ہے کہ ہم اس سے راہ عمل طے کریں گے۔مولانا سراج الدین ''رسول خداؐ کا طریقہ تربیت'' میں لکھتے ہیں۔

''مربی کا ایک بنیادی وصف صبر وتحمل بھی ہے۔اس کے بغیر کوئی شخص بھی تربیت جیسے نازک فریضہ کی ادائیگی نہیں کرسکتا۔میں نے جب غور کیا کہ جن انبیاء کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر نے بکریاں چرائی ہیں ۔خود مربی اعظم سے مشیت ایزدی نے بکریاں چرانے کا کام لیا ہے تو میری سمجھ میں یہ حکمت آئی کہ بکری ایک کمزور جانور ہے۔اگر اس کو ایک ڈنڈا زور سے مار دیا جائے تو وہ ادھر اُدھر بہت زیادہ بھٹکتی ہے۔جب ایک بکری ریوڑ سے الگ ہو کر ایک طرف کو بھاگتی ہے تو چرواہا غصہ میں لاٹھی لیے اس کے پیچھے بھاگتا ہے، مگر جیسے ہی لاٹھی رسید کرنا چاہتا ہے تو یہ تصور اس کے ہاتھ کو روک دیتا ہے کہ ایک ہی لاٹھی سے بکری کا کام تمام ہو جائے گا۔وہ اس بکری کو آہستہ سے ریوڑ میں واپس لاتا ہے کہ دوسری بکری ایک طرف کو کھسک لیتی ہے اور اس طرح چرواہے کو بار بار اپنے مشکل جذبات کو قابو میں کرنا پڑتا ہے۔غالباً انبیاء کے اس منصب کی نزاکت کے پیش نظر انہیں صبر وتحمل اور نزاکتوں کے احساس کا عادی بنانے کے لئے ان سے بکریاں چروائی گئیں۔''

بچوں کی تربیت میں اگر یہی اصول پیش نظر رہے تو انشاء اللہ ہم ناکام نہیں ہوں گے۔

اللہ کے نام سے ابتدا

آیئے! اللہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اسے شہ رگ سے قریب بھی محسوس کریں

کسیبھی کام کی ابتدا کرنا، پہلا قدم اٹھانا، مشکل امر ہوتا ہے۔ اجنبیت کی دیوار ختم کرنے کو پہلا جملہ، ناراضگی کو دور کرنے کے لئے پہلا احساس۔ غرض جذبہ ہو یا عمل ابتدا ہی ڈھیروں وقت کا تقاضا کرتا ہے۔ کسی بھی کام کی منصوبہ بندی بہت سی دماغ سوزی اور وقت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پھر اس جذبے اور منصوبہ بندی کو عملی شکل میں لانے کا پہلا مرحلہ ہی انسان کے لئے امتحان بن جاتا ہے۔

افتتاح کرنا کسی سے؟ کس وقت ؟ برکت والے ہاتھ اور رحمتوں کی برسات والا وقت تلاش کئے جاتے ہیں۔ انسانی سوچ ہر تہذیب میں وہم میں مبتلا ہوتی ہے'' کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے'' کی متذبذب حالت سے انسان، خاندان، ادارے ضرور آشنا ہوتے ہیں تعلق، معاہدہ یا رشتہ جوڑنا ہو یا توڑنا ہو، وقت اکثر ریت کی طرح مٹھی سے پھسلتا جاتا ہے اور پھر وقت کا ایک ذرہ بھی عمر کی مٹھی میں باقی نہیں بچتا۔ انسان سوچتا رہ جاتا ہے جانے ابتدا کیسے کب اور کیوں کی تھی اور انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے بھی حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہے۔

زندگی کے یہ سارے مناظر ایک دن سب کو دیکھنے ہیں جب ہر شخص اپنے ہر کام کی ابتدا کو وحشت بھری آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا۔ جنہوں نے ابتدا اپنے رحمان ورحیم رب کی انگلی پکڑ کر کی ہوگی وہ مطمئن ومسرور ہوں گے۔ جنہوں نے اپنے کاموں کا، اپنی عمارتوں اور منصوبوں کا افتتاح قادرِ مطلق کے ہاتھ سے کرایا ہوگا وہ سرخ رو ہوں گے۔

ہم سب اسی کے نام سے تو ہر کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ اسی کا نام لے کر، اس کے کلام کی تلاوت کر کے، اس کے نبیؐ کی نعت گا کر ہمیں تو بچپن سے بسم اللہ پڑھ کر کام کی ابتدا سکھائی جاتی ہے۔ پھر ہم ان برکتوں والے ہاتھوں اور رحمتوں والے وقت کی تلاش میں کیوں مارے مارے پھرتے ہیں۔ وہ رب تو سب کا برابر رب ہے۔ سب کے ساتھ اُس کی رحمت ہے اُس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ ہم تو سنیما میں فلم کا مہورت بھی تلاوت ونعت سے کرتے ہیں۔ شادی بیاہ ہو، دفتر اور گھر کی پہلی اینٹ ہو یا کہیں داخل ہونے کا پہلا قدم ہو۔ اُس رب کے پیارے نام سے یا اُس کے پیارے بندے کے قدم سے ابتدا کرتے ہیں۔ اُس کے برگزیدہ بندوں کی قبروں پر چادریں چڑھانے کی منتیں مانتے ہیں۔ پھر بھی ہر طرف بے برکتی کا دھواں سانس کیوں بند کئے دیتا ہے؟

کیا ختم قرآن کروا کر، وہ بھی معاوضہ دے کر بلائے گئے بچوں سے، وہ ادراک ہوسکتا ہے جو قرآن چاہتا ہے؟ کیا کسی بھی تقریب سے پہلے چند آیات تلاوت کے بعد ہماری ساری ذمہ داریاں پوری ہو جاتی ہیں؟ کیا کسی ''بڑے نام'' کے ہاتھ سے فیتہ کٹوا کر یا تختی کی رونمائی کروا کر، مزاروں پر چادریں چڑھا کر رحمتوں اور برکتوں کے دریا میں غوطے لگانے کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے؟ صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے لفظوں کی ادائیگی وہ قوت لاسکتی ہے کہ دریا کی طغیانی معمول کی روانی میں بدل جائے؟

اللہ رحمان ورحیم کے ہاتھ سے کوئی کام شروع کروالینا کتنی بڑی سعادت ہے۔ کہاں ہے وہ شعور، یقین، ادراک اور ایمان جس کی وجہ سے بسم اللہ کہنا ہی کافی ہو جاتا ہو؟

کام چھوٹا ہو یا بڑا، جز وقتی ہو یا کل وقتی، اس کی بھی روح ہوتی ہے اور یہ روح وہ ابتدا ہوتی ہے جس کو لے کر کام شروع کیا جاتا ہے۔

جس روح کو کام میں پھونکا گیا ہوگا وہی اس میں کارفرما ہوگی .....
رحمانی یا شیطانی.....رحمانی الفاظ شیطانی روح کو نہیں بنا سکتے۔

معلوم یہی ہوتا ہے کہ ہر جگہ، ہر وقت، ہر رشتہ، ہر کام میں روح پراگندہ ہے۔

اس پراگندگی کو دور کرنے کا ایک ہی حل ہے کہ کام کی ابتدا اللہ، رحمان اور رحیم کے ہاتھوں سے کروائی جائے تو اس کا ہاتھ محسوس بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی روح پھونک کر خاک کے پتلے کو اشرف المخلوقات بنا دیا، اس اللہ رحمان رحیم کے ناموں کا ادراک، ان ناموں کی عظمت کا احساس اس رب کریم کا ساتھ ہر کام میں برکت و رحمت شامل کر دے گا۔ ہر کام، عمل، جذبہ کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر کی جائے تو اس کی موجودگی کا یقین کامل بھی تو ہو .....آیئے، بسم اللہ کریں اور اللہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اس کو اپنے قریب، قریب تر، شہ رگ سے بھی قریب محسوس کریں۔ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ''زندگی'' کا احساس تازہ کریں۔

عنزہ عثمان

کچن کارنر

عربین موتی پلاؤ

اشیا: چاول 1 کلو، گھی 1 پاؤ، نمک حسب ذائقہ، باریک قیمہ ½ کلو، پیاز 4 عدد (کٹی ہوئی)، انڈے 1 عدد، لہسن ایک چائے کا چمچ پسا ہوا، ہری مرچیں پسی ہوئی 2 عدد، زیرہ 1 چائے کا چمچ، کالی مرچ 1 چائے کا چمچ، دہی 1 پاؤ، ادرک پسا ہوا (ایک چائے کا چمچ)، سرخ مرچ 1 کھانے کا چمچ، ٹماٹر 2 عدد۔

ترکیب: قیمے میں انڈہ، اور تمام مصالحہ جات آدھے آدھے ڈال لیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے کوفتے بنا کر تل لیں۔ اس کے بعد چاولوں کے لئے علیحدہ سے ایک دیگچی میں گھی ڈال کر پیاز ڈال دیں۔ بادامی رنگ کی ہونے پر اس میں ٹماٹر، دہی اور باقی کے تمام مصالحے ملا دیں اور خوب بھونیں ساتھ میں بھنے ہوئے کوفتے بھی ڈال دیں اور جب مصالحہ اچھی طرح بُھن جائے تو ایک لیٹر پانی ڈال دیں اور ابلنے دیں۔ جب پانی ابلنے لگے تو چاول ڈال کر پکنے دیں مزیدار موتی پلاؤ تیار ہے۔

نظامی قیمہ

مٹن قیمہ 500 گرام، پیاز ایک بڑی کُتر لیں، لہسن ادرک پیسٹ 1 کھانے کا چمچ، سبز مرچ 2 عدد کتر لیں، دہی ½ کپ، زیرہ 1 چائے کا چمچ، ثابت گرم مصالحہ 1 کھانے کا چمچ، نمک حسبِ ذائقہ، ٹماٹر پیسٹ ½ کپ، ادرک باریک لمبے سلائس، تیل حسب ضرورت۔

ترکیب: ایک پین میں تیل گرم کر کے زیرہ اور ثابت گرم مصالحہ کڑکڑائیں پھر پیاز ڈال کر ہلکی گلابی رنگ ہونے تک فرائی کریں۔ پھر اس میں لہسن ادرک پیسٹ اور سبز مرچ ڈال کر اتنا بھونیں کہ پیاز براؤن ہو جائے۔ ان کو تیل سے نکال کر بلینڈ کر لیں اور دہی میں نمک، لال مرچ اور یہ بلینڈ کیا ہوا مصالحہ ڈال لیں۔

پین میں تیل ڈال کر گرم کریں اور اس میں قیمہ ڈال کر اتنا بھونیں کہ قیمے کا پانی خشک ہو جائے اور تیل نظر آنے لگے۔ اب اس میں دہی والا مصالحہ ڈال کر بھونتی رہیں۔ پھر آدھا کپ پانی اور ٹماٹو پیسٹ شامل کر کے بھونیں پھر پین کو ڈھک دیں۔ ہلکی آنچ پر 8 سے 10 منٹ تک پکائیں قیمہ تیار ہو جائے تو اوپر سے ہرا دھنیا اور ادرک ڈال کر پیش کریں۔

حیدرآبادی اچاری بینگن

گول بینگن آدھا کلو (بینگن میں چار کٹ لگا کر پانی میں بھگو دیں)، ٹماٹر ایک پاؤ، دہی آدھا پاؤ، پیاز درمیانی ایک عدد، لہسن ادرک پیسٹ 2 کھانے کے چمچے، سرخ مرچ ایک چائے کا چمچہ، ثابت دھنیا تین چائے کے چمچے، گرم مصالحہ پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، سونف آدھا چائے کا چمچ، کلونجی آدھا چائے کا چمچ، رائی ایک چائے کا چمچ، کھوپرا پسا ہوا ایک چائے کا چمچ، خشخاش پسی ہوئی ایک چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، ثابت ہری مرچ 6 عدد (بیچ میں کٹ لگا لیں)، ہرا دھنیا حسب پسند، لیموں کا رس دو چائے کے چمچ، ہلدی حسب پسند، گھی یا تیل ایک پیالی۔

ترکیب: ایک دیگچی میں تیل گرم کریں اس میں ثابت زیرہ، سونف، رائی، لہسن ادرک کا پیسٹ، ہلدی اور باریک کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال کر خوب بھونیں۔ بعد ازاں بینگن ڈال کر کچھ دیر ہلائیں تا کہ مصالحہ جذب ہو جائے اور پانچ منٹ ہلکی آنچ پر دم کی طرح رکھ دیں۔

اس کے بعد دہی ڈال کر مکس کریں اور مزید پانچ منٹ کا دم لگا دیں اس کے بعد لیموں کا رس ، ہری مرچ ، کھوپرا اور خشخاش ڈال کر پھر سے پانچ سے سات منٹ کے لئے ڈھک دیں ۔ آنچ مدھم رہے اور آخر میں ہرا دھنیا کاٹ کر ڈالیں ۔ یہ تنوری روٹی یا اُبلے ہوئے چاولوں کے ساتھ خوب لطف دیں گے ۔

سوہن حلوہ

اشیا: نشاستہ (گیہوں کا ست) ایک پاؤ، شکر ایک کلوگرام، پانی ایک لیٹر، گھی ایک پاؤ، چھوٹی الائچی ایک چھٹا نک، ٹاٹری، ایک چٹکی، جائفل دو عدد، جلوتری، تھوڑی سی، زردے کا رنگ ایک چٹکی، بادام کی گری حسب منشا، پستہ حسبِ منشا۔

ترکیب: جائفل ،جلوتری ، ٹاٹری اور الائچی الگ الگ پیس لیں ۔ ایک پتیلی میں آدھا لیٹر پانی اور شکر ڈالیں ۔ ساتھ پسی ہوئی ٹاٹری، الائچی اور جائفل جلوتری بھی شامل کر کے دھیمی آنچ پر پکائیں یہ چاشنی ہے ۔ بقیہ پانی میں نشاستہ اور زردہ رنگ ڈال کر اچھی طرح ملائیں ۔ اب اسے ململ یا باریک کپڑے میں چھان لیں ۔ چھنے ہوئے آمیزے کو چاشنی میں ڈال دیں آمیزے کو دھیمی آنچ پر چند منٹ پکائیں ۔ چمچہ مسلسل چلاتی رہیں اب پستہ اور بادام بھی چھیل کر آمیزے میں ڈال دیں ۔ قوام حلوے کی طرح ہو جائے تو گھی کا ایک ایک کر کے چمچہ ڈالیں اور اتنا بھونیں کہ آمیزہ گھی چھوڑ دے ۔ چولہا بند کر کے ٹرے میں ہلکا سا گھی لگائیں ۔ آمیزے کو ٹرے میں ڈال کر برابر کر لیں اور ٹھنڈا ہونے پر حسب پسند ٹکڑے کاٹ لیں ۔

ڈاکٹر نجیب الحق۔محمد عاکف

صحت مند زندگی کیسے!

۳-رات کو کھانے پینے کے برتنوں کا ڈھانپنا:

رات کے وقت اگر کھانے پینے کی اشیاء کھلی چھوڑ دی جائیں تو ان پر کیڑے مکوڑے اور زہریلے جانور جمع ہو کر انھیں جراثیم اور زہر سے آلودہ کر دیتے ہیں۔اور ان چیزوں کے کھا لینے سے صحت کو بہت نقصان پہنچ سکتا ہے۔مثلاً لال بیگ گٹروں وغیرہ میں پلتے ہیں اور غلاظت سے ہیضہ، اسہال، ٹائفائیڈ اور پیچش جیسی خطرناک بیماریوں کے جراثیم کھانوں میں منتقل کر سکتے ہیں۔لہٰذا رات کو کھانے پینے کی کوئی چیز بغیر اچھی طرح ڈھکے ہوئے نہ چھوڑی جائے۔اس بارے میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تاکید فرماتے تھے کہ پانی کے مشکیزوں کا منہ اچھی طرح باندھ دیا کرو اور کھانے کے برتن کو ڈھک کر اس پر کوئی لکڑی وغیرہ رکھ دیا کرو۔ہمیں اس سنت پر عمل کر کے اپنے اور اہل خاندان کو ضرر سے بچانا چاہیے۔

۴-گھروں میں قالینوں کا استعمال

(Wall to wall carpeting) یعنی پورے کمرے میں قالین چپکا کر بچھانے میں دو طرح کا نقصان ہے۔ایک تو ان میں گرد اور جراثیم جمع ہوتے رہتے ہیں جس کی مکمل صفائی کسی طرح ممکن نہیں۔ساتھ ہی ساتھ ان قالینوں میں جمع شدہ خوراک کے ذرات ضرر رساں کیڑوں کی پرورش گاہ بن جاتے ہیں۔قالینوں میں پرورش پانے والے بہت ہی باریک کیڑوں میں اہم Mites ہیں جن کے بارے میں یہ طے شدہ امر ہے کہ یہ زندہ یا مردہ دونوں حالتوں میں سانس کے ذریعہ پھیپھڑوں میں داخل ہو کر دمہ کا مرض پیدا کرتے ہیں۔دوسرا یہ کہ گھٹیا قسم کے قالینوں سے باریک باریک ریشے نکلتے رہتے ہیں جو مختلف سانس کی بیماریاں پیدا کر سکتے ہیں۔لہٰذا قالینوں کا استعمال ترک کر دینا چاہیے یا وہ قالین استعمال کریں جنھیں وقتاً فوقتاً باہر نکال کر جھاڑ لیا جائے اور دھوپ میں ڈال دیا جا سکے۔

۵-غسل خانوں کی صفائی میں تیزابی مائع کا استعمال:

گزشتہ چند سالوں میں غسل خانوں کی صفائی میں تیزابی سالوشن (drain openers & basin cleaners) وغیرہ کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔اس سالوشن کا بڑا جزو ہائڈروکلورک ایسڈ یعنی نمک کا تیزاب ہوتا ہے۔اس میں سے ہر وقت تیزاب کے بخارات نکلتے رہتے ہیں جو صحت کے لیے انتہائی مضر ہیں۔اس کا استعمال کم سے کم کریں اور اسے استعمال کرتے وقت غسل خانے کا دروازہ و روشن دان کھول دیں اور اپنے منہ و ناک پر گیلا تولیہ لپیٹ لیں۔ایگزہاسٹ فین چلا دیں۔

۶-گھر کے اندر جوتوں کا استعمال

گھر سے باہر پہننے والے جوتے کو گھر کے اندر ہرگز استعمال نہ کریں اور غسل خانہ کے جوتے کو غسل خانہ کے اندر ہی اتار دیا کریں۔خاص کر باورچی خانہ اور کھانے کے کمرہ میں ان جوتوں کو بالکل نہ لے جائیں۔کیونکہ ان کے ذریعہ پیٹ کی مختلف بیماریاں پھیل سکتی ہیں۔باورچی خانے کے جوتے الگ رکھیں۔

۷-گھر کے اندر روشنی اور ہوا کا گزر

گھر کے اندر روشنی اور ہوا کے گزر کو یقینی بنائیں جو کہ کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر اور کھڑکیوں کو کھول کر کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا آسان و سادہ اصولوں پر عمل کر کے آپ اپنے خاندان کی صحت کی حفاظت کر سکتے ہیں۔(جاری ہے)

محمد اسماعیل ریحان

جہادِ افغانستان کے دس سال

کچھ یادیں، کچھ حقائق

افغانستان پر امریکی یلغار کے دس سال پورے ہو رہے ہیں اور چشم کشا خبریں تواتر سے آ رہی ہیں۔ چند روز قبل ہی کابل میں طالبان کے حملوں میں ایک سو دس امریکی و افغان فوجی ہلاک ہوئے ہیں۔ دریں اثناء امریکی افواج کے سبکدوش ہونے والے جنرل پیٹریاس نے اپنی ریٹائرمنٹ کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارا معاشی بحران افغان جنگ کو متاثر کر سکتا ہے۔ افسوس کہ جنرل صاحب کو یہ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی کہ درحقیقت یہ معاشی بحران پیدا ہی افغان جنگ سے ہوا ہے۔ ادھر تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبے میں جاری چار فریقی مذاکرات کے اعلامیے میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ نیٹو افواج کے انخلاء کے بعد افغانستان میں اقوام متحدہ کردار ادا کرے۔

یہ خبریں پڑھ کر میرا ذہن دس سال پیچھے چلا گیا ہے، جب امریکی صدر جارج بش نے ایک لٹیرے کی طرح دندناتے ہوئے افغانستان پر حملہ آور ہونے کا اعلان کیا تھا اور لگتا تھا کہ امریکی دنیا کے آخری کونے تک اپنے مخالفین کا تعاقب کریں گے۔ طالبان سربراہ نے مقابلے کا چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا:

''امریکا نے حملہ کیا تو گوریلا جنگ شروع کریں گے۔ امریکہ کے آگے جھک کر اسلام کو نیچا نہیں کریں گے۔''

سات اکتوبر 2001ء کو رات کے 9 بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے کہ افغانستان کے شہروں کابل، قندھار، جلال آباد، مزار شریف اور ہرات پر کروز میزائل برسنے لگے۔ اس کارروائی کے ساتھ ہی امریکا میں صدر بش نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''امریکا اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ مہم دہشت گردی کے خاتمے تک جاری رہے گی۔ برطانیہ کے علاوہ کینیڈا، آسٹریلیا، جرمنی اور فرانس اس کارروائی میں ہمارے ساتھ ہیں جبکہ چالیس ممالک خفیہ معلومات اور دیگر حوالوں سے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہمارا مقصد دہشت گردوں کا نیٹ ورک تباہ کرنا ہے۔ دہشت گردوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔ یہ جنگ وسیع ہو گی اور جو حکومت بھی بے گناہ لوگوں کے قاتلوں کو پناہ دے گی اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ اس جنگ میں امریکا تھکے گا نہ ناکام ہوگا اور نہ ہی کوئی غلطی کی جائے گی۔''

طالبان حکومت گرانے کے لئے امریکی حملے پورے دو ماہ تک جاری رہے۔ طالبان نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن آخر کار شمالی اتحاد کی غداری اور مسلم ممالک کی بے اعتنائی کے سبب انہیں کابل اور قندھار سمیت اپنے تمام مراکز سے انخلاء کرنا پڑا، جس میں ہزاروں طالبان قیدی بھی بنے اور شہید بھی ہوئے۔

طالبان حکومت تین نومبر 1994ء کو قندھار پر قبضے کے ساتھ وجود میں آئی تھی اور سات سال ایک ماہ چار دن تک قائم رہ کر سات دسمبر 2001ء کو ختم ہوئی۔ قندھار سے انخلاء سے قبل ملا محمد عمر نے بی بی سی کی وساطت سے دنیا کو ایک حیرت انگیز پیغام دیا تھا، جو ہر سال اس موقع پر مجھے ضرور یاد آتا ہے۔ ملا عمر نے کہا تھا:

''عنقریب امریکا تباہ ہونے والا ہے۔ پیش گوئی یاد رکھیں۔ دنیا افغانستان میں جلد تبدیلی دیکھے گی۔ ہم از سر نو منظم ہو رہے ہیں۔''

طالبان حکومت کو ختم کرنے کے فوراً بعد امریکا نے پہلے جرمنی میں بون کانفرنس اور پھر افغانستان میں لویہ جرگہ منعقد کرا کے اپنے منظور نظر حامد کرزئی کو ملک کا حکمران بنا دیا۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق اس فیصلے پر اتفاق رائے کے لئے جرگے کے ہر رکن کو بیس بیس ہزار امریکی ڈالر دیئے گئے تھے۔ کرزئی حکومت کے زیر سایہ اگر افغانستان نے کسی میدان میں ترقی کی تو وہ منشیات کی کاشت تھی۔ طالبان نے منشیات کا

خاتمہ کر دیا تھا، مگر کرزئی حکومت کی ''برکات'' یہ تھیں کہ پہلے ہی سال ملک بھر میں 400 ٹن افیون پیدا ہوئی اور افغانستان منشیات کی پیداوار میں پہلے نمبر پر آ گیا۔

بہر کیف افغانستان میں تین سال کے لئے سیاسی سیٹ اپ بنا کر امریکا خاصا مطمئن ہو گیا تھا کہ وہ افغان عوام اور دنیائے اسلام کی نظروں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہا ہے۔ چنانچہ اس جنگ کے پانچویں مہینے میں صدر جارج بش نے اپنی کامیابیوں کے نشے میں عجیب وغریب لن ترانیاں ہانکیں۔ واشنگٹن پوسٹ میگزین نے 31 مئی 2002ء کے شمارے میں صدر بش کی جو چشم کشا تقریر شائع کی، اسکے چند اقتباسات تاریخی ریکارڈ میں محفوظ کرنے کے قابل ہیں۔ بش نے کہا:

''آج کی رات میں نہایت فخر کے ساتھ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سفید فام یہودی مسیحی اتحاد بے انتہا طاقتور ہو چکا ہے، ہماری تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ امریکی طاقت، امریکی بالادستی اور امریکی اقدار نے ایسی عظمت، ایسا احترام اور ایسی قبولیت حاصل کی ہو جیسا کہ آج ان کو حاصل ہے۔ امریکی جھنڈا، امریکی مسلح افواج، سی آئی اے اور ایف بی آئی دہشت گردی کے خوف سے آزادی لانے اور امن و امان قائم رکھنے کی خاطر سو سے زائد ممالک میں موجود ہیں..... افغان عورتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے برقعوں سے آزاد ہو چکی ہیں۔ افغانستان کی لڑکیاں اسکولوں کو واپس لوٹ گئی ہیں، وہ یہ پڑھ رہی ہیں کہ کیسے ہمیں امریکا اور مغرب نے کامرانی اور کامیابی عطا کی۔ مغربی تہذیب وثقافت کی سب سے بڑی علامت، ٹیلی ویژن، افغان باشندوں کی زندگی میں ایک مرتبہ پھر جگہ بنا چکا ہے..... افغانستان کے لوگ آج بڑے خوش ہیں کہ وہ اپنے ملک میں آزادانہ گھوم پھر سکتے ہیں، امریکیوں بالخصوص امریکی بچوں نے افغانستان کو کھانے پینے کی چیزیں اور مال واسباب بھی بھیج کر جو عظیم کام انجام دیا ہے، اس پر وہ جتنا فخر کریں کم ہے۔

مجھے اس بات سے خوشی ہے کہ میں افغانی بچوں کو اپنے عمدہ کھانوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں کہ وہ ''چیز'' ''جیلی'' اور بسکٹ کھا رہے ہیں..... ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم امن اور خفیہ معلومات کے میدان میں اپنے کردار کو وسیع کریں۔ ایف بی آئی اور سی آئی اے امریکی مسلمانوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں، جن میں سے ہزاروں گرفتار ہو چکے ہیں۔ ہم نے حقوق اور شہری آزادی کو بہت مقید کر دیا ہے..... امریکی وزیر دفاع ڈونالڈ رمزفیلڈ، ڈاکٹر کونڈالیزا رائس، پال وولفیٹز، رچرڈ پیرل، کانگریس کے یہودی وفد اور امریکی اسرائیلی کمیٹی برائے تعلقات عامہ (AIPAC) کی مدد سے، ہم نے امریکا کی عالمی خارجہ پالیسی کو زبردست ترقی عطا کی ہے، لہٰذا امریکا آج کے بعد کسی بھی ایسے عالمی معاہدے میں فریق کا کردار ادا نہیں کرے گا، جو ہمارے اقتصادی اور عسکری مقاصد کے لئے خطرہ ہو، میں یہاں اپنے دوست ''شیرون'' (اسرائیلی وزیر اعظم) کا قول مستعار لوں گا کہ ہم ان تمام عالمی تنظیموں کو جو امریکا یا اسرائیل کے قومی مفادات کے خلاف ہیں، لاتعلق سمجھتے ہیں خواہ اقوام متحدہ ہو، یورپی یونین ہو یا پھر عرب لیگ ہو، جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ اس کو فوری طور پر تحلیل کر دینا چاہیے، ریڈ کراس کی عالمی کمیٹی ہو، یا ویٹی کن ہو یا پھر تمام اسلامی تنظیمیں.....

برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر کے بقول اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعلان کریں کہ ہمیں دنیا کی تشکیل از سر نو کرنے دو تا کہ سارا عالم ہماری طرح ہو جائے۔ خدا کے فضل سے ہم سفید فام تہذیب یافتہ اور شہری لوگ اس دنیا پر اپنے آزادانہ، رحم دلانہ اور خوبصورت عقائد مسلط کر کے رہیں گے، جو ہمارے مال و دولت اور ہمارے آفاقی پیغام کی بھوکی ہے۔ آج کے بعد مردوں کو داڑھی رکھنے کا پابند نہیں ہونا پڑے گا اور خواتین کو اپنے چہرے اور جسم چھپانے پر مجبور ہونا نہیں پڑے گا، آج سے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، ہر جگہ کے لوگ شراب پی سکیں گے، سگریٹ نوشی کر سکیں گے اور ہم جنس پرستی سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ وہ آزاد ہیں، اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے، خواہ وہ ہوٹلوں میں یا اپنے بیڈ روموں میں جنسی فلمیں دیکھیں یا خود اس عمل میں حصہ لیں۔ جہاں تک ہماری کمپنیوں کا تعلق ہے جو اس طرح کی مصنوعات تیار کرتی ہیں مستقبل قریب میں وہ کسی بھی ایسے ملک کی پابندیوں کے بغیر دنیا کے کونے کونے میں پہنچ سکیں گی۔''

امریکی صدر کا یہ بیان طویل ہے، میں نے چند اقتباسات ہی ذکر کیے ہیں۔ انہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جنگِ فغانستان، دو ملکوں کی نہیں دو تہذیبوں کی جنگ ہے۔

☆☆☆

(بہ شکریہ روزنامہ اسلام)